روحانیت کے سربستہ اسرار، عشقِ مجازی و عشقِ حقیقی کو سمجھنے اور پانے کیلئے مستند ترین کتاب

عشق کی سائنس

"میں" سے "تو" تک

نعمان نیّر کلاچوی

روحانیت کے سربستہ اسرار، عشقِ مجازی و عشقِ حقیقی کو سمجھنے اور پانے کیلئے مستند ترین کتاب

عشق کی سائنس

"میں" سے "تو" تک

نعمان نیئر کلاچوی

فیکٹ پبلی کیشنز
14/B علی پلازہ سکینڈ فلور ٹیمپل روڈ لاہور فون: 042 36374538
Website: www.factpublications.com
Email: factpublications@fact.com

جملہ حقوق محفوظ

Ishaq Ke Science

By Noman Nayyir Kalachvi

کتاب : عشق کی سائنس

مصنف : نعمان نیئر کلاچوی

ایڈیٹر : وسیم شیخ

ڈیزائن : محمد ذوالفقار

قانونی مشیر : تیموری لاء ایسوی ایٹس 13 فین روڈ لاہور، فون: 04237323202

قیمت : Rs:250/

Fact Publications aims to promote creative
work through book publishing
More details for our publications, Visit at:
www.factpublications.com
We welcome your feed back at:
editor@factpublications.com

بہترین کتاب کی اشاعت کیلئے رابطہ کریں:
042 36374538. 0300 9482775

فہرست

انتساب

نہ من تنہا در ایں مے خانہ مستم
جنید و شبلی و عطّار شُد مست
بروئے پاک شمس الدین تبریز
کہ ملاّ برسرِ بازار شُد مست

(پیرومرشد حضرت جلال الدین رومیؒ)

مقدمہ

"انسان ایک خالص جذباتی وجود ہے اور جب تک زندہ رہتا ہے جذبات کے حصار میں ہی قید رہتا ہے۔" یہ الفاظ جنابِ من ابوالعقل نعمان نیر کلاچوی کے ہیں، ایک شام جب میں تھکی ہاری فیس بک پر آن ہوئی تو میں نے ایک ٹیگ چیک کی جس میں یہ جملہ لکھا ہوا نظر آیا۔ کافی دیر تک میں اس جملے کے اندر اُترنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اعصاب مضمحل ہونے کی وجہ سے سمجھ نہ آسکی۔ چنانچہ دوسری شام میں نے سب سے پہلے اس جملے کے خالق ابوالعقل نعمان نیر کلاچوی صاحب سے براہِ راست رابطہ کیا۔ بشریات کی طالب علم ہونے کے ناتے میں انسان سے منسلک ہر علم اور رویہ کے نت نئے پہلوؤں کی دریافت کی ٹوہ میں لگی رہتی ہوں۔ مجھے ایسا لگا کہ اس جملے میں کچھ نیا ہے جو میری دسترس سے باہر ہے۔ اس لئے اس جملے کی روح تک پہنچنے کیلئے میں نے جنابِ من ابوالعقل کلاچوی صاحب سے رابطہ کیا۔ برقی تعامل ہونے کے باوجود بھی میں خاصی نروس تھی کیونکہ میں نہیں جانتی تھیں کہ جناب ابوالعقل کلاچوی کس عمر اور کس علمی سطح کے انسان ہیں؟ آپ سے رسمی کلمات کے بعد میں یہ جان کر حیران رہ گئی کہ آپ تو ماشاءاللہ بالکل جوان ہیں جبکہ میں سمجھی تھی کہ آپ کوئی عمر رسیدہ شخص ہوں گے بہر حال اُس شام کلاچوی صاحب سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کر کے بہت اچھا لگا۔ تصوف کے ساتھ ایک موروثی ربط ہونے کے باعث صوفی منش شخصیات سے راہ و رسم کی میں ابتداء ہی سے شائق تھی۔ ابوالعقل صاحب سے میری گفتگو خاصی مثبت اور زود اثر رہی۔ ابوالعقل کلاچوی صاحب کے متعلق میں کچھ کہنے سے

ہمیشہ اعراض کرتی رہی ہوں کیونکہ آپ بلا شک وشبہ عبقری شخصیت کے مالک ہیں۔ ابتداء میں آپ کو میں نے ایک مذہبی سکالر کے طور پر جانا لیکن جیسے جیسے تکلفات سے منزہ ہوتی گئی آپ کی شخصیت کے مختلف اور دلچسپ پہلو سامنے آتے گئے ، شاعر، فلسفی، میوزیشن اور صوفی جناب ابوالعقل نعمان نیر کلاچوی صاحب علم و ہنر کا بے کراں سمندر ہیں اور یہ میں بغیر کسی مبالغہ کے عرض کر رہی ہوں۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ آپ سے براہِ راست ملاقات کر کے مذکورہ بالا تمام صفات کا براہِ راست مشاہدہ کر سکتا ہے۔ میری اوقات اس قدر نہیں جس قدر کلاچوی صاحب نوازتے رہے ہیں۔ البتہ صرف اتنا کہوں گی کہ کلاچوی صاحب نے ہمیشہ دلیل اور منطق سے بات کی کبھی غصہ نہیں کیا اور نہ ہی کبھی آپ سے کوئی ترش کلام سننے کو ملا اور یہ میں آپ کی تعریف نہیں کر رہی بلکہ میرا یہ دعوٰی ہے کہ آپ سے ملاقات کرنے والا کوئی بھی شخص آپ کے متعلق یہ رائے ضرور قائم کرے گا۔ کلاچوی صاحب کا خصوصی التفات تو ایک طرف آپ خاکسارہ کی ہر قدم پر مسلسل علمی و اخلاقی رہنمائی کرتے رہے ہیں، مذہب ہو یا فلسفہ، تصوف ہو یا سائنس ہر موضوع پر مدلل اور زبردست علمی گفتگو کرنے کی مہارت رکھنے والے ابوالعقل کلاچوی صاحب ایک نہایت منکسر المزاج اور درویش صفت انسان ہیں۔ سادگی کا یہ عالم ہے کہ ایک بار آپ کو ایک امیج میں کے ایل انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر سلیپر اور ہنگامی لباس (Casual Dress) میں دیکھا اور نفاست پسند اتنے کہ جب بھی آپ کے ساتھ چائے یا کافی پینے کا موقع ملا آپ ویٹر کو کہنے کی بجائے خود ہی واش بیسن جا کے کپ دھو لیتے ، آپ کے ساتھ بتائے گئے لمحات کسی روحانی خزائن سے کم نہیں تصور کرتی۔

اُردو میں، میں نے بہت کم لکھا ہے اس لئے اُردو زبان میں وہ مہارت بھی نہیں جو آپ کو حاصل ہے لیکن آپ کے بے حد اصرار پر عشق کی سائنس کے متعلق کچھ کہنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ عشق کی سائنس کے متعلق صرف اتنا کہوں گی کہ یہ کتاب عام آدمی کیلئے علم و حکمت کا خزانہ، عالم کیلئے معرفت ، عارف کیلئے عشق اور عاشق کیلئے لطفِ مسلسل ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ تصوف و منازلِ سلوک پر اب تک ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں ، مختلف صوفیائے کرام نے

تصوف کے مختلف موضوعات پر قلم اُٹھایا اور خوب خوب حق ادا کیا لیکن عشق کی سائنس میں مجھے جو خاص بات نظر آئی وہ دراصل اس کا بالکل جدید اور جامع اسلوب ہے۔ تصوف پر مبنی کوئی بھی کتاب اتنی مختصر اور جامع ابھی تک نظر سے نہیں گزری۔ تصوف کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات نوٹ کی کہ اس موضوع پر بڑی ضخیم قسم کی کتب لکھی گئیں ہیں جن کو پڑھنے کیلئے ایک عمر درکار ہے۔ غالباً اسی بنیادی صورتحال کو مدِ نظر رکھتے ہو آپ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔

عشق کی سائنس نہ تو اس قدر ضخیم ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے میں کئی ماہ لگ جائیں اور نہ ہی اتنی قلیل کہ موضوعات کو سمجھنے میں دشواری ہو بلکہ تحریر اور حجم میں ایک بہترین توازن قائم کیا گیا ہے۔ عشق کی سائنس کے موضوعات مختصر اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر کمال گہرائی لئے ہوئے ہیں۔ حضرت جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول مبارک عشق کی سائنس پر پورا پورا اُتر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ''بہترین کلام وہ ہے جو الفاظ کے اعتبار سے تو کم مگر معنی کے اعتبار سے زیادہ ہو۔'' عشق کی سائنس کے متعلق کچھ کہنے کی میری اوقات نہیں یہ تو بس جنابِ من حضرت کلاچوی صاحب کی خصوصی محبت ہے جو یہ چند الفاظ لکھنے کی ہمت اپنے اندر پیدا کر لی، نہیں تو یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم، بہرحال تصوف سے معمولی دلچسپی رکھنے والوں کیلئے بھی عشق کی سائنس لطف کا ایک بیکراں دریا ہے۔ عشق کی سائنس کے متعلق مزید کچھ کہہ کر آپ کے اور کتاب کے درمیان حائل نہیں ہونا چاہتی۔ اس لئے اسی دعا کے ساتھ اجازت کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تصوف کو سمجھنے اور صوفیائے کرام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطاء فرمائے۔۔۔ آمین

سیدہ ایمان علی چشتی

ایم فل اینتھر و پالوجی F/8 اسلام آباد

پیش لفظ

انسان ایک خالص جذباتی وجود ہے گوکہ اس جذبہ کو بظاہر مادہ اور حیات میں مقید کر دیا گیا، جذبہ کو قرآن کریم میں روح سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشادِ ربانی ہے کہ "قل الروح من امر ربی" (فرمادیجئے کہ روح تو اللہ کا حکم ہے) یعنی روح یا جذبہ دراصل امرِ الٰہی ہے قارئین یہ سوچ رہے ہونگے کہ جذبہ اگر روح ہی ہے تو پھر اس کو ایک نئی اصطلاح جذبہ سے کیوں تعبیر کیا جارہا ہے تو نہایت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ روح اور جذبہ میں اصل کے لحاظ سے تو کوئی فرق نہیں لیکن روح ایک خالص مذہبی اصطلاح ہے جبکہ جذبہ خالص عاشقانہ اصطلاح چونکہ مجذوب کا موضوع اصلی عشق ہے اِس لئے روح کی جگہ ہم نے عاشقانہ اصطلاح جذبہ استعمال کیا ہے جذبہ کو انگریزی زبان میں (Emotion) اور ہندی میں بھاونہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کتاب ہذا میں، میں نے عشقِ وجودیہ جسے عام اصطلاح میں عشقِ مجازی کہا جاتا ہے اور عشقِ روحانیہ جو کہ اصل ہے کا علمی، عقلی اور سائنسی پیمانوں سے احاطہ کیا ہے اور بتدریج ایک علمی و عقلی ارتقاء سے ثابت کیا ہے کہ ایک راہِ حق کا مسافر کس طرح بتدریج مختلف مقاماتِ باطنیہ سے ہوتا ہوا عشقِ وجودیہ تک پہنچتا ہے اور پھر آخر میں عشقِ روحانیہ یعنی عشقِ حقیقی میں جا کے مدغم ہو جاتا ہے۔ عرض کرتا چلوں کہ میرے نزدیک عشقِ روحانیہ سے مراد دراصل عشقِ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو عشق کی اوّل و آخر ہے۔ عشقِ محمد کریم ﷺ ہی اصل ہے، علاوہ ازیں فرع یا تعلیم و تہذیب ہے گوکہ فروع کی افادیت و تہذیب کی اہمیت سے چنداں اعراض نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اصل تک پہنچنے کیلئے ہمیشہ نقل کا سہارا

لیا جاتا ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحت ہے نہ منطقی، لیکن میرے نزدیک عشق کی اہمیت ہی دراصل اس منزلت پر مبنی ہے کہ قدیم صوفیانہ اصطلاح عشقِ مجازی کی جگہ میں نے عشقِ وجودیہ کی متبادل اصطلاح وضع کرلی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجاز کا عام فہم مطلب اکثریت معاذ اللہ جھوٹ یا دھوکہ سے تعبیر کرتی ہے، حالانکہ یہ صریح علمی سہو و صحتِ عشق کی ایک مطلق سطحی تعبیر ہے۔ اس لئے اس سطحی تصور کو عوامی اذہان سے فرو کرنے کیلئے عشقِ مجازی کی جگہ عشقِ وجودیہ کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ عشقِ وجودیہ پر ایک مستقل باب قائم کیا گیا جس میں اس پر سیرِ حاصل بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب ہذا میں میرا سفرِ عشق ایک خاص علمی و منطقی اسلوب سے پیش کیا گیا ہے اور اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ کچھ ذہین عشاق کے نزدیک عشق بغیر کسی فلسفہ و جہد سے واقع ہوتا ہے۔ عین ممکن ہو کہ ایسا ہی ہو لیکن میرے نزدیک قوانینِ قدرت کی رُو سے بغیر جہد کے دسترس سے آگہی اور اُس کی اہمیت نہیں ہوتی، اس کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ ایک شخص کو اگر کہیں سے کھجور کا خوشہ مل جائے تو یقیناً یہ اُس کیلئے نعمتِ عظمیٰ سے کم نہیں لیکن اس کے برعکس ایک شخص کھجور کا درخت لگاتا ہے پھر ایک طویل عرصہ تک اُس کی آبیاری کرتا ہے، شبانہ روز محنت کرکے جب وہ درخت اس نہج پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ اُس کو پھل دینے کے قابل ہو جائے تو وہ آبیار اُس درخت کے پھل کی جو قدر کرتا ہے وہ اُس کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا اور دیکھنے والے دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ درخت اور آبیار بظاہر دو وجود ہیں لیکن اپنے اصل کے اعتبار سے وہ آبیار پوری طرح درخت بن چکا ہوتا ہے اور درخت آبیار، یہی عشقِ محمد کریم ﷺ ہے۔ ہمارے متقدمین صوفیائے کرام جن کو مجذوب عشاق کرام سے موسوم کرتا ہے بھی مسلسل جدوجہد کے بعد اِس مقامِ آفریں پر پہنچے تھے۔ اس سلسلہ میں مجذوب کے پیر و مرشد حضرت جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو علومِ ظاہریہ و باطنیہ کے علاوہ علومِ متداولہ کے بھی ماہر تھے مگر اُنہوں نے مسلسل جدوجہد کے ذریعے مقامِ عشقِ محمد کریم ﷺ کو پایا اور پھر وہ مولانا رومیؒ جو کبھی علم و عقل اور منطق کے اُستاد ہوا کرتے تھے، عقل و خرد کی حقیقت جاننے کے بعد کچھ یوں سخن طراز ہیں:

عقل آمد دین و دنیا شد
عشق آمد در دو عالم کامیاب

مولانا رومی فرماتے ہیں کہ "انسان نے ہوش سنبھالا تو غرق ہو گیا پھر جب اس نے ہوش گوایا تو مُراد کو پہنچا۔"

میں نے مرشدی رومیؒ سے مسلسل اور باقاعدہ روحانی اکتساب کیا۔ آپ ہی کی بدولت عقل و فلسفہ کی خشک ولایعنی قیل وقال سے رہائی پا کر عشقِ محمد کریم ﷺ کے سائے میں پناہ لی اور پھر جذبہ کی شدت بڑھتی اس نہج تک جا پہنچی کہ مجذوب اپنے الفاظ کی بجائے سلطان العارفین حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ میں بیان کرنا مناسب سمجھتا ہے۔ چنانچہ آپ اس کیفیتِ منتہاء کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

اے تن میرا چشمہ ہووے تے میں مرشد ویکھ نہ رجاں ہُو
لُوں لُوں دے مُڈھ لکھ لکھ چشماں اک کھولاں اک کجاں ہُو

"میرے جسم کا ایک ایک مسام آنکھ بن کر محبوب کا دیدار کر رہا ہے لیکن پھر بھی دل نہیں بھرتا۔"

اکابر صوفیائے کرام میں سے جد العارفین حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی، حضرت ابو بکر شبلی اور حضرت سلطان باہو رحمہ اللہ علیہم بلاشبہ لباد پر مقیم تھے، معرفت کے بعد لباد پر قیام گو کہ ایک مشکل امر ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ اکثر عارفین کو لباد پر قیام کا حکم فرمایا کرتے، چنانچہ آپ ہی نے زبدۃ العشاق وخلاصۃ العارفین حضرت سیدی حسین ابن منصور الحلاج کو لباد پر قیام کی نصیحت فرمائی تھی جو سیدی نے یہ فرما کر مسترد کر دی تھی کہ "اے شیخ چاہے کچھ بھی ہو میرے جو دل میں ہے زبان پر لاتا رہوں گا چاہے اس سے کسی کے رازوں کے افشاء ہونے کا ڈر ہو یا نہ ہو۔"

معرفت کے بعد لباد پر قیام نہایت اذیت ناک ہوتا ہے کیونکہ عرفان دراصل لباد کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر سالک پھر ظاہریت سے مبراء ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

سیدی وسندی حضرت حسین ابن منصور اس اہم نکتہ کی نصیحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ "میں نے ادیان کے بارے گہرے تفکر میں تحقیق کی اور انہیں کئی شاخوں والی جڑوں کی طرح پایا کسی سے اس کے دین کے بارے میں مت پوچھو کہ (ایسا کرنا) اسے جڑ سے جدا کر دیتا ہے "اصل" اسے ڈھونڈ لے گا جیسے جیسے معانی آشکار ہوں گے وہ جان لے گا۔"

بلاشبہ سیدی حسین ابن منصور کو اصل نے ڈھونڈ لیا تھا لیکن آپ نے اس پر قیام کرنا مناسب نہ سمجھا اور یہ بھی مشیتِ ایزدی میں شامل تھا۔ آپ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی سے ایک مکالمہ کے دوران فرماتے ہیں کہ "اے شیخ آپ کے خیال میں مجھ سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں آخران کا ذمہ دار کون ہے۔" سید الطائفہ نے فرمایا: "تم خود ہو" سیدی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے فرمایا: "کہ نہیں میں جو کچھ کرتا ہوں یا جو کچھ کروں گا سب من جانب اللہ ہے اور یہ ایک ایسا راز ہے جسے میں کسی بھی طور پوشیدہ نہیں رکھ سکتا رکھنا بھی چاہوں تو مجھ سے ایسا نہیں ہوگا۔"

یہی وجہ ہے کہ پھر آپ نے بالآخر انا الحق کا نعرہ لگایا اور ظواہرین کے ہاں معتوب ٹھہرے۔

آپ کے اِس مقامِ احدیت کو مرشدی حضرت رومیؒ کچھ بیان فرماتے ہیں:

نے نے کہ ہمو بود کہ می گفت انا الحق، در صورتِ منصور
منصور نہ بود آں کہ بر آں دار بر آمد، ناداں بہ گماں خُد

"وہ منصور نہیں تھا جس نے انا الحق (میں ہی حق ہوں) کا نعرہ لگایا اور پھر سولی پر چڑھ گیا بلکہ وہ حق ہی تھا پس ایسے کرنے پر وہ نادان سمجھا گیا۔"

مقامِ انا الحق پر کتاب میں ایک علیحدہ سے باب شامل ہے، مزید تفصیلی گفتگو اسی باب میں کی جائے گی۔ میرے نزدیک شریعت ضابطہ معرفت ولایت اور عشق وجد وسرور ہے۔ ایک سالک جب اپنا سفر شروع کرتا ہے تو وہ خود کو کسی مقام پر روک تو سکتا ہے لیکن قوانینِ فطرت کے مطابق اُس مقام پر اکتفاء نہیں کر سکتا کیونکہ خوب سے خوب تر کی تلاش انسان کو بالآخر فناء سے دوچار کرتی ہے۔ یہی عالم آج میرا بھی ہے کہ عرفان پر اکتفاء میرے بس میں نہیں تھا۔ بارہا کوشش کے باوجود

بھی میں خود کو معرفت تک محدود نہ کر سکا۔ اس لئے مجھے فناء کی طرف آنا پڑا۔ میں بھی سیدی منصور کی طرح یہی عرض کرتا ہے کہ یہ سب مشیتِ ایزدی کے بغیر ممکن نہیں کہ تُو بالاخر من کو اپنے ہاں جذب ہی کر لیتا ہے۔ اِسی مقامِ احدیت کو ایک پنجابی صوفی شاعر کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

تیرے ہوندیاں سوندیاں محبوبا تیرا مجرم ہاں جے میں ہوواں

سُوں تیری سوہنڑے تُو یون ہیں ہووے شرک عیاں جے میں ہواں

"اے میرے محبوب جب تُو ہے تو میں کہاں ہوں مجھے تیری قسم تُو ہے اگر میں ایسا نہ کہوں تو یہ شرک ہوگا۔"

میں نے اس کتاب میں فناء تک پہنچنے کے تمام تر مراحل کو مجرب ترتیب سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ عین ممکن ہے اس میں کوئی علمی و منطقی اور تجرباتی کوتاہیاں موجود ہوں کیونکہ مجذوب کا کرب لامتناہی اور تجربہ محدود ہے۔ بہر کیف اُمید ہے کہ زیرک عشاق کرام اپنی نظر کرم سے مجذوب کی علمی کوتاہیوں کو صرفِ نظر فرما کر شفقتِ مطلق کا مظاہرہ فرمائیں گے۔ اِسی اُمید کے ساتھ اپنی گفتگو کا اختتام چاہتا ہوں کہ قارئین میری ننگ و جنگ سے بے نیازی کو در گزر فرما کر سفرِ عشق کی طرف کوچ کی کوشش کریں گے۔ دعا ہے کہ خدائے عزیز ہمارا قول و فعل مزین فرما کر ہمیں اُسی راستہ پر چلنے کی توفیق عطاء فرمائے جس میں اُس کی مسلسل رضا و خیر شامل ہو، آمین۔

میں اپنی گفتگو کا اختتام سیدی ابن منصور کے اُن فقید المثل الفاظ سے کروں گا جن پر عمل پیرا ہو کر آج ہم ہر قسم کے باہمی شر و فتن سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"کسی سے اُس کے دین کے متعلق مت پوچھو کہ ایسا کرنا اُسے جڑ سے جدا کر دیتا ہے۔"

مجذوب

نعمان نیر کلاچوی

تجزیہ ذات

تجزیہ دراصل کسی چیز کی جرح (Examine) کرنے جبکہ ذات مادہ حیات اور روح کے مرکب کو کہتے ہیں تجزیہ ذات کو عام انگریزی اصطلاح میں (Self Analysis) کہا جاتا ہے تجزیہ ذات کو ہم ایک عام اصطلاح خود بینی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں ہمارے ہاں ابتداء ہی سے صوفیائے کرام نے خود بینی پر توجہ دلانا شروع کر دی تھی، نہ صرف خود توجہ دی بلکہ عوام کو بھی اِس اہم اور بنیادی حکمت کی جانب راغب کیا بلکہ بعض صوفیائے کرام نے تو خود بینی کو ظواہریت سے بھی اہم جانا ہمارے صوفیائے کرام کے نزدیک خود بینی کی کیا اہمیت ہے۔اِس کی ایک جھلک حضرت بلھے شاہ علیہ الرحمہ کے اس بند میں ملاحظہ کرتے ہیں۔آپ فرماتے ہیں:

پڑھ پڑھ علم ہزار کتاباں ، کدی اپنڑے آپ نوں پڑھیا نیں
جا جا وڑدے مندر مسیتی ، کدی من اپنڑے وچ وڑیا نیں

حضرت بلھے شاہ فرماتے ہیں کہ ''اے مخاطب! آپ نے کئی کتب پڑھ کر ڈھیر سارا علم تو حاصل کر لیا لیکن کبھی اپنے باطن کو نہیں پڑھا اسی طرح مسجد و مندر تو با قاعدہ سے جاتا رہا ہے لیکن کبھی اپنے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔''

گویا صوفیائے کرام کے نزدیک سب سے بہترین علم اپنی ذات کا علم ہے۔غالباً قرآن کی اِسی اعلان کی تابعداری صوفیائے کرام کو سمجھ آگئی تھی کہ ''ونحن اقرب الیہ من حبل الورید'' (اور ہم تو انسان کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں) عرفانِ ذات کے متعلق امام الکلام حضرت امام

غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اے عزیز یہ جان لے اور یقین کر لے کہ اپنے آپ کو پہچاننا خدا تعالیٰ کی پہچان کی کنجی ہے چنانچہ ساری کائنات میں تجھ سے زیادہ نزدیک کوئی چیز نہیں۔''

علاوہ ازیں اسی مقام کو حدیثِ پاک میں کچھ اِس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ''من عرفه نفسه فقد عرف ربه ''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا گویا اُس نے اپنے خدا کو پہچان لیا پس اپنی ذات کو پہچاننے کیلئے سب سے بہترین عمل اپنی ذات کا تجزیہ کرنا اپنی ذات پر غور کرنا ہے۔ یہ ایک ایسا مبارک عمل ہے کہ جس کے ذریعے انسان خدائے عزیز کے قریب ہو کے اُس کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔ اپنی ذات پر سے گزر کر کوئی انسان فلاح کو نہیں پہنچ سکتا، چنانچہ میرا تجربہ ہے کہ خود بینی ہی اصل الاصول ہے اور اِسی ہی کے ذریعے انسان خود کو تمام شرور سے محفوظ کر سکتا ہے۔ اپنی ذات کا تجزیہ کئے بغیر انسان نہ اپنے آپ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی خدائے عزیز کی اور یہ ایک ایسا سعید اور صلیح عمل ہے جس کے ذریعے انسان صحیح معنوں میں تسلیم و رضا کا پیکر بن جاتا ہے۔ اِس عمل کی سب سے اہم افادیت یہ ہے کہ اِس کے ذریعے مخلوق اور خالق کا باہم ربط قائم ہو جاتا ہے بلکہ انسان اپنی تمام تر دینی و دنیاوی ذمہ داریوں سے بھی کما حقہ آگاہ ہو جاتا ہے۔ مجذوب کے نزدیک علم کی ابتداء تجزیہ ذات ہے جبکہ علم کا پہلا سبق بھی تجزیہ ذات سے شروع ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں حُسنِ اخلاق اور تہذیب النفس کا بحران دراصل تجزیہ ذات سے دوری کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ ہم نے علم اور اخلاق اپنی ذات سے باہر تلاش کرنا چاہا لیکن درحقیقت یہ سب کچھ انسان کے اندر ہی موجود ہے۔ اسی باطنی روشنی سے دوری کے نتیجے میں آج ہم دن بدن اخلاقی پستی میں جا رہے ہیں۔ ہمارا یہ رویہ یقیناً آج ایک المیہ کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اگر ہم حُسن اخلاق اور تہذیب النفس اپنی ذات سے شروع کریں تو عین ممکن ہے کہ آج ہمارا معاشرہ جنت نظیر بن جائے لیکن ہماری شومئی قسمت کہ ہم ہمیشہ مخاطب کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ ہم چیزوں کو اپنے اندر ڈھونڈنے کی بجائے باہر ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن حق تو یہ ہے کہ سب کچھ انسان کے

اندر ہے باہر کچھ نہیں رکھا۔ ہم مخاطب کی اصلاح کے درپے ہوتے ہیں لیکن اپنی ذات کے مطالعہ سے دور رہتے ہیں۔ ہمارا یہی رویہ پورے سماج کے اخلاقی وسماجی بگاڑ کا باعث بنتا ہے جبکہ دلچسپ بات یہ کہ ہمیں اِس کے متعلق علم بھی نہیں ہوتا کہ خرابی کہاں سے واقع ہو رہی ہے۔ چنانچہ پھر ہم بجائے خود بینی کی طرف توجہ دینے کے جہاں بینی کی طرف نکل پڑتے ہیں جس سے حالات بہتر ہونے کی بجائے مزید بگڑتے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں عموماً ظاہر پر توجہ دی جاتی ہے ظاہر کو اُجلا بنانے کیلئے ہمیں مختلف قواعد وضوابط فراہم کئے جاتے ہیں لیکن اپنی ذات کی اصلاح اور تجزیہ کیلئے ہمارے ہاں عام طور پر تساہل ہی برتا جاتا ہے حالانکہ انسانی اعمال کا سرچشمہ دراصل اُس کا باطن ہے جب تک ایک انسان کا باطن تمام تر آلائشوں سے پاک نہیں ہو جاتا تب تک کسی انسان سے بھلائی کی اُمید رکھنا عبث ہے کیونکہ باطن میں موجود آلائش انسانی اعمال کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں اور جب انسانی اعمال قباحت کا شکار ہو جائیں تو معاشرہ اخلاقی طور پر دیوالیہ بن جاتا ہے۔ ظاہر کی اصلاح اور تصنع بھی اہم ہے لیکن اہمیت صرف باطن کو حاصل ہے کیونکہ باطن انسانی ذات کا سرچشمہ اور ہر عمل کا مبداء ہے۔ تجزیہ ذات کے ذریعہ انسان شعورِ ذات حاصل کرتا ہے اور جسے شعورِ ذات حاصل ہو گیا وہ کائنات کے ذرے ذرے کا محافظ بن جاتا ہے۔ چنانچہ لقائے نعاس میں امام الاکلام حضرت امام غزالی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"تجزیہ ذات دراصل اصل کی معرفت ہے۔ میں نے ایک طویل عمر علم وحکمت تلاش کرنے میں گزار دی لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس دوران میں علم کا ذرہ اور حکمت کی بُو تک نہ سونگھ سکا، پھر میں تجزیہ ذات کی جانب بڑھا تو میں نے جانا کہ علم دین کا تخم کیا ہے؟"

کائنات میں سب سے بہترین علم دراصل اپنی ذات کا علم ہے۔ پس یہی دین ومذہب کی بنیاد ہے۔ تجزیہ ذات کے بعد انسان جس مقام پر پہنچتا ہے وہی مقام دراصل اصل ہوتا ہے اور دین ومذہب کے تمام تر مبادیات وانعال کا مقصدِ اصلی بھی دراصل یہی ہے، چنانچہ تجزیہ ذات کی ابتداء ہم اُن عناصر کی تعریف سے کرتے ہیں جن کی ترکیب سے انسانی ذات وقوع پذیر ہوئی ہے۔

مادہ

مادہ کو انگریزی زبان میں (Matter) کہا جاتا ہے جس کی عام تعریف یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو حجم اور وزن رکھے دراصل مادہ کہلاتی ہے۔ سائنس نے مادہ کو باقاعدہ ایک علم کی شکل دے دی ہے جسے سائنسی اصطلاح میں (Physics) یعنی علم الطبیعیات کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ علم الطبیعیات میں عموماً بے جان اشیاء کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ہمارا مطمحِ نظر چونکہ انسان کے مادی وجود کے متعلق آگاہی حاصل کرنا ہے، لہٰذا ہم اپنی حدود میں رہ کے بات کریں گے۔ سائنسی لحاظ سے انسان کے مادی وجود کا زیادہ تر حصہ دراصل پانی (Water) اور کاربن (Carbon) کا مرکب ہے۔ کاربن ایک ایسی خشک اور بوسیدہ مٹی کو کہا جاتا ہے جو جل کر کوئلہ کی شکل اختیار کر چکی ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "**ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حما مسنون**"

"اور ہم نے انسان کو جلی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا۔"

آیتِ کریمہ کی تفسیر میں مفسرِ قرآن حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تین اقسام کی مٹی سے پیدا کیا گیا۔ صلصال، حماء اور طین لازب سے۔

پس طین لازب عمدہ مٹی ہے، حماء سے مراد گارا اور کیچڑ جبکہ صلصال سے مراد ایسی مٹی جسے کوٹ کر باریک کر دیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں صلصال کا مطلب یہی ہے کہ ایسی خشک مٹی جو کھنکھناتی ہو، دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"**انا خلقناھم من طین لازب**"

''اور ہم نے انسان کو چپکتی ہوئی مٹی سے بنایا''

طین مٹی کو کہتے ہیں جبکہ لازب سے مُراد چپکتی ہوئی۔ صاحب مفردات القرآن امام راغب اصفہانی کے مطابق طین لازب دراصل پانی میں ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں، خواہ پانی کا اثر زائل کیوں نہ ہو جائے، ماحصل یہ کہ انسان کی بنیاد دراصل پانی اور مٹی ہے۔

حدیثِ پاک میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا کیا گیا جس کو تمام روئے زمین سے لیا گیا۔ پس بنو آدم زمین کی اُس مٹی کے موافق پیدا ہوئے ہیں، بعض ان میں سے سرخ بعض سیاہ بعض سفید اور بعض گندمی رنگ کے ہیں۔ اس طرح خوش اخلاق، بداخلاق اور نیک و بد ہر قسم کے لوگ موجود ہیں، فرماتے ہیں کہ اس کے بعد اُس مٹی کو چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ اُس میں بُو پیدا ہو گئی پھر اسے چھوڑ دیا گیا، یہاں تک کہ خشک ہو کر ٹھیکرے کی شکل میں بن گئی۔ پس ثابت ہوا کہ انسان دراصل خشک مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر ہم اس خشک اور بے جان مٹی کو مادہ یا matter سے تعبیر کریں تو بجا ہوگا اور سائنس کی یہ تحقیق کہ انسان کاربن اور پانی کا مرکب ہے مبنی برحق معلوم ہوتی ہے۔ اپنے اصل کے اعتبار سے سائنس فطرت کے اُن سربستہ اسرار کے انکشاف کا نام ہے جن کی طرف قرآن میں کہیں تفصیلاً تو کہیں اجمالاً اشارہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ سائنس جب کوئی دریافت سامنے لاتی ہے تو وہ دراصل قرآن کے دیئے گئے اشارات پر ایک عملی تحقیق بن کر سامنے آجاتی ہے، انسان جن عناصر سے مل کر بنا ہے، اُس کا ایک اجمالی خاکہ قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس پر مزید تحقیق اور ان کے مکمل خدوخال دریافت کرنا طبیعیات کے اُن علماء کا کام ہے جو اس شعبہ میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں عموماً طبیعیات کے علم کو اہمیت نہیں دی جاتی اور نہ ہی اس طرف جانے کو سعید سمجھا جاتا ہے حالانکہ انسان کی تمام تر بنیادی ضروریات کا مصدر یہی طبیعیات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کائنات کو وجود بخشا اور اسے ہماری افادیت کیلئے قائم کیا اُس کے متعلق جاننا بھی انسان کا حق ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''وسخر الشمس والقمر'' (اور ہم نے تمہارے لئے سورج اور چاند مسخر کر دیئے)

پس ثابت ہوا کہ علمِ کائنات کا حصول بھی ایک انسان کیلئے اُتنا ہی اہم ہے جتنا کہ مذہب کا علم حاصل کرنا، مادہ کا علم حاصل کرنا اس لئے اہم ہے کہ انسانی ذات کے مرکبات میں سے مادہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے جمود پسند علماء اور راہِ سلوک سے نابلد ظاہر پرست صوفی اکثر و بیشتر سائنس اور اُس کی دریافت کے خلاف بولتے اور لکھتے رہتے ہیں حالانکہ یہی حضرات سائنس کے موجودہ تمام تر سہولیات سے پوری طرح لطف بھی لے رہے ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک فلسفہ، مذہب، سائنس اور تصوف دراصل منزلِ حق کے مختلف راستے ہیں کیونکہ منطق مختلف اور ماحصل ایک ہی ہے، مذہب ضابطہ ہے تو سائنس مسلسل جستجو، اسی طرح اگر فلسفہ اصل کا تجزیہ ہے تو تصوف اصل کی معرفت، گویا ہر طالب اپنے مقام پر پورے اخلاص کے ساتھ راہِ حق کا مسافر ہے، کسی بھی رستے کے مسافر پر تنقید کی گنجائش موجود نہیں کیونکہ کوئی انسان بھی گمراہ نہیں ہونا چاہتا۔ اس لئے کسی بھی طالبِ حق کے سفر اور اُس کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہئے کیونکہ حسنِ خلق کا بنیادی تقاضا یہی ہے۔

حیات

حیات کو انگریزی زبان میں (Life) کہا جاتا ہے۔ سائنس میں اِس علم کو با قاعدہ انسانی وجود کی ایک اہم شاخ قرار دے دیا گیا ہے۔ اِس علم کو سائنس میں (Biology) یعنی علم الاحیاتیات کہا جاتا ہے۔ اس کو اگر ہم عام مفہوم میں بیان کریں تو حیات دراصل ہر جاندار کے اعضاء کے باہمی تعامل کو کہتے ہیں لیکن ہمارا مطمح چونکہ انسانی حیات ہے اس لئے ہم اپنے حصار میں بات کریں گے۔ علم الاحیاتیات یعنی (Biology) کے مطابق ہر جاندار کے اعضاء کا آپس میں ایک متعین مہم کی جانب مسلسل تعامل حیات کہلاتا ہے۔ بلاشبہ انسان ایک پیچیدہ عضویاتی مشین ہے۔ اس کا ہر عضو دوسرے عضو سے باہمی تعامل کے نتیجے میں جسم کو ایک خاص زاویہ کی جانب رواں رکھے ہوئے ہے۔ اعضاء کا یہ باہمی تعامل ثابت تو ہے لیکن مستقل نہیں۔ یہ ہرگز ویسا نہیں ہے جیسے نظر آرہا ہے۔ انسان کا حیاتیاتی ڈھانچہ دنیا میں مستقل نہیں رہتا، آخرکار اس تنظیمی ڈھانچے نے ختم ہی ہو جانا ہوتا ہے۔ اعضاء کا یہ باہمی سنگم کیا ہے اور اس کی اس دنیا میں کیا حیثیت ہے اس کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور" (اور دنیا کی زندگی تو صریح دھوکا ہے) دھوکہ دراصل کسی چیز کے ظاہر اور باطن میں زبردست تضاد کو کہتے ہیں گویا جو چیز جیسے نظر آرہی ہو ویسے نہ ہو، مادہ اور حیات ہر جاندار کی خاصیت ہے۔ حیات کے لحاظ سے انسان اور دوسرے جاندار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق کہاں واقع ہوتا ہے یہ ہم آگے چل کر روح کے باب میں بیان کریں گے۔ انسانی حیات کا تعلق بظاہر گوشت اور خون کا مرکب ہے اور یہ گوشت اور خون دراصل اُلوہی جوہر روح کی وجہ سے قائم ہے۔ اس سلسلہ میں مفسرِ قرآن حضرت

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے آپ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے اندر اپنی روح پھونکی تو وہ روح اُن کے سر کی جانب سے داخل ہوئی اور جسم کے جس حصہ میں پہنچتی وہ حصہ گوشت اور خون میں تبدیل ہو جاتا، پس ثابت ہوا کہ حیات کی بنیاد روح ہے۔ روح ہی دراصل انسانی اعضاء کو ایک خاص مہم پر لگائے ہوئے ہے۔ ایک خاص مہم سے مُراد دراصل روح کا وہ مخصوص متعین وقت جو اس تنظیمی ڈھانچے میں رہتا ہے یعنی انسانی اعضاء دراصل روح کی جانب سے دیئے گئے (Task) یعنی شغل کی تابعداری کر رہے ہوتے ہیں۔ اعضاء کے اس باہمی شغل کو (Biology) میں کچھ یوں بیان کیا جاتا ہے۔

A biological system (organ system or body system) is a group of organs that work together to perform a certain task.

انسانی اعضاء کے اس مخصوص شغل کو قرآن کچھ یوں بیان کرتا ہے:

"وما الحیوة الدنیا الا لعب و لھو" "اور دنیاوی زندگی کچھ بھی نہیں بجز شغل کے"

پس ثابت ہوا کہ انسانی اعضاء کا باہمی تعامل دراصل ایک شغل ہے جس نے ایک مخصوص مدت تک جاری رہنا ہوتا ہے۔ مادہ اور حیات کی بنیاد دراصل روح ہے۔ مادہ انسان کا بنیادی جوہر اور حیات اِس جوہر کی حرکی صورت ہے چنانچہ تحریکِ محض کا نام حیات ہے۔ اس بناء پر انسان اور کسی بھی متحرک وجود میں کوئی فرق نہیں، زمین اور زیرِ زمین موجود تمام متحرک وجود مادہ اور حیات کا مرکب ہیں۔ انسان کو شرف روح کی بدولت حاصل ہوا کیونکہ روح ایک مخصوص اُلوہی ذکاوت ہے جو صرف اور صرف انسان ہی کا خاصا ہے۔ روح مادہ اور حیات کے مرکب کو وہ اُلوہی رونق بخشتی ہے جو کائنات میں صرف اور صرف انسان ہی خاصا ہے۔ گویا ظاہری قالب کی تکمیل کے بعد روح کے مرکب نے اس قالب کو تمام مخلوقات سے افضل بنا دیا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی"

"اور جب ہم نے انسان کے ظاہری قالب کو مکمل کیا تو پھر اُس میں اپنا جوہر (روح) پھونک دی۔"

روح

روح عربی زبان کے لفظ ریح سے مشتق ہے جس کے معنی ہوا کے ہیں۔ قدیم زمانے میں انسان کا یہ علمی تجربہ تھا کہ انسان کے اندر کوئی ہوا نما چیز ہوتی ہے جو مرنے کے بعد انسان کے اعضاء سے نکل کر کہیں دوسرے غیر مرئی مقام پر منتقل ہو جاتی ہے۔ روح کو انگریزی زبان میں (Soul) سے تعبیر کیا جاتا ہے جبکہ علمِ فعلیات یعنی (Psychology) میں اِسے (Psyche) یعنی روح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علمِ فعلیات میں اس کی تعریف ان الفاظ سے کی جاتی ہے۔

In psychology, the psyche is the totality of the human mind, conscious, and unconscious. Psychology is the scientific or objective study of the psyche.

روح کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''ویسئلونک عن الروح ، قل الروح من امر ربی''

ترجمہ: ''یہ لوگ آپ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ یہ میرے رب کا حکم ہے۔''

گویا روح امرِ الٰہی ہے۔ روح کی اس سے بہترین اور جامع تعریف ممکن نہیں۔ سائنس میں روح کا تصور ایک عملی نوعیت اختیار کر گیا۔ مطلب یہ کہ سائنس نے روح کے قدیم مذہبی پیراڈائم کو منہدم کر کے ایک جدید عملی شکل دے دی جسے آج سائنسی اصطلاح میں (Chemistry) یعنی

کیمیاء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کیمیاء دان اس نکتہ کے قائل ہیں کہ روح یعنی کیمیاء ہی انسانی جسم اور حیات کی تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ روح کی تعریف علم کیمیاء کے ماہر کچھ بیان کرتے ہیں:

Chemistry, a branch of physical science, is the study of the composition, structure, properties and change of matter.

سائنس نے روح کو کیمسٹری میں تبدیل کر دیا لیکن روح کی بقاء کی تردید ممکن نہیں۔ جدید سائنس کی بنیاد Theory of Evolution (نظریہ ارتقاء) پر قائم ہے۔ جدید سائنس کے مطابق کائنات کا ذرہ ذرہ Evolute (بتدریج آگے بڑھنا) ہو رہا ہے، گویا اسی بنیادی اُصول کے مطابق کیمیاء یعنی روح بھی بتدریج آگے بڑھ رہی ہے۔ روح کا آگے بڑھنا ہی دراصل روح کی بقاء کا ضامن ہے۔ روح ہو یا کیمیاء بہر حال اسکی بقاء لابدی ہے۔ کسی چیز کا نام بدل دینے سے اُس کا بنیادی جوہر نہیں بدل جاتا، بعض طبیعیات دان روح کو Energy یعنی توانائی سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ روح ہو یا سول کیمسٹری ہو یا توانائی، اپنے جوہر کے اعتبار سے وہ ویسے ہی رہے گی جیسے کہ وہ ہے۔ روح کے متعلق حدیثِ پاک میں سب سے جامع، مدلل اور مستند رہنمائی کی گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا پھر ان میں روح پھونکی۔'' پس حدیثِ پاک سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ روح انسانی وجود میں ایک اُلوہی غیر مرئی جوہر ہے۔ مجذوب کی طویل علمی و تحقیقی جدوجہد کے مطابق روح ایک مثبت اُلوہی جوہر ہے۔ جس کو ہر زمانے میں مختلف اصطلاحات سے تعبیر کیا گیا ہے روح کے باب میں مجذوب ایک طویل عرصہ کے غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ روح دراصل ایک مثبت اُلوہی جوہر ہے۔ جو انسان کو ہمیشہ بھلائی کی جانب لگاتے رکھتا ہے۔ اس ضمن میں، میں نے روح کے وہ نام جو زبانِ زدِ عام ہیں پیش کر کے یہ عرض کرنے کی کوشش کی ہے کہ نام بدل دینے سے کسی چیز کا جوہر نہیں بدل جاتا۔ میرے نزدیک روح کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ یعنی کہ دودھ کبھی دہی بن جاتا ہے تو کبھی لسی

،کبھی گھی تو کبھی مکھن، اپنے جوہر کے لحاظ سے وہ ایک ہی چیز ہے، چنانچہ ذیل میں روح کے وہ مختلف نام جو ہم شعوری اور لاشعوری طور پر اپنی گفتگو میں استعمال کئے جاتے ہیں، پیش کئے جا رہے ہیں جو اپنے اصل کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہے۔

اسمائے روح

1:جذبہ

2:دل

3:مزاج

4:من

5:ذات

6:عقل

7:شعور

8:حکمت

9:دانائی

10:خیال

11:فہم

12:دانش

13:فکر

14:تصور

15:ظن

علاوہ ازیں روح کے ہر زبان میں مختلف نام ہو سکتے ہیں جیسا کہ ہندی میں اسے آتما سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انگریزی میں اکثر Sprit یا Soul کہا جاتا ہے۔لب لباب یہ کہ روح دراصل

ایک مثبت انسانی جوہر ہے جو صرف انسان ہی کا خاصا ہے۔ روح ہمیشہ انسان کو بھلائی کی جانب لگائے رکھتی ہے۔ ایمان روح کا میوہ ہے۔ اس طرح محبت، عبادت، نیکی، خدمت، ہمدردی، خلوص، صبر، شکر، دیانت داری اور وفا تمام نیک افعال دراصل روح ہی کی دین ہیں۔ روح کی سب سے ارفع دین دراصل ''ایمان'' یعنی محبت ہے۔ محبت کی کئی ایک شکلیں ہو سکتی ہیں لیکن روح کا بنیادی جوہر ''محبت'' ہے۔ ایمان اور محبت میں محض الفاظ کا فرق ہے۔ یہی محبت جب اپنے عروج پر پہنچتی ہے تو ''عشق'' کہلاتی ہے، یہی قرآن کریم کی اصطلاح میں نفسِ مطمئنہ اور یہی انسانی حیات کا مقصدِ اصلی ہے اور بلاشبہ اسی کو ہی دائمی بقاء حاصل ہے۔ روح کی مداومت کے ثبوت قدیم ترین سنسکرتی مذہبی صحائف میں بھی درج ہیں۔ چنانچہ بھگون گیتا میں ہے:

''انسان کا جوہرِ اصلی یعنی روح زمان و مکاں سے وراء ہے۔''

گویا قدیم ترین مذہبی صحیفہ میں بھی روح کی بقاء کی بات کی گئی ہے۔ روح کی بقاء کا تذکرہ قدیم ایرانی وخشور (پیمبر) حضرت زرتشت نے بھی منزل من الایزداں صحائف میں بیان کیا ہے۔ اوستا میں ہے کہ ''جسم فانی اور روح غیر فانی ہے۔''

روح کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے ہم ذیل میں روح کے چار مدارج بیان کرتے ہیں:

روحِ وصفیہ

روح وصفیہ سے ہماری مراد دراصل روح مطلق ہے یعنی کہ انسان کا وہ بنیادی جوہر جو مادہ اور حیات کی تشکیل کرتا ہے اسے ہم انسان کا شرف بھی کہہ سکتے ہیں۔ گویا انسان اور دوسرے جانداروں میں تمیز روح کے اسی درجہ کے سبب روا رکھی جاتی ہے۔ روح کے اس مقام کا تعلق انسان کے لاشعوری افعال سے ہوتا ہے گویا یہ ایک بنیادی روحانی رتبہ ہے جس میں انسان حاضر و موجود میں مقید ہو کر تقلیدِ مطلق کی بنیاد پر اپنے تمام افعال سرانجام دیتا ہے۔ عوام کی اکثریت چونکہ کسل و تساہل کی رسیا ہوتی ہے اس لئے عموماً روح کے اِسی رتبہ پر مقیم ہوتی ہے کیونکہ عوام کے نزدیک افعالِ لطیفہ ہی دراصل سرچشمہ حیات ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں تخصیص کا پہلو صرف اس

قدر ہے کہ انسان مطلق وغیر مشروط اپنی روایات وتمدن کا پجاری ہوتا ہے۔ روحِ وصفیہ کا حامل حصولِ لذات میں غرق اُلوہی نظم اور معرفتِ ذات وکائنات کی جانب توجہ دینے کا اہل نہیں ہوتا۔ حاملِ روحِ وصفیہ ہدایت کیلئے ہمیشہ تقلید واقتداء کا قائل ہوتا ہے۔ معاشرہ میں مروج مذہبی اقدار پر کبھی تندہی تو کبھی تساہل سے عمل پیرا یہ انسان اپنی عمر کے ابتدائی دو حصے محض سمعنا واطعنا کے مصداق بسر کر دیتا ہے۔ البتہ جب اعصاب مضمحل ہو جاتے ہیں اور فکرِ عاقبت لاحق ہو جاتی ہے تو یہ انسان روحِ وصفیہ سے روحِ علویہ کا رُخ کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ فطرتاً انسان ضرورت کا پجاری اور احساسِ استقبال سے عاری ہوتا ہے۔

روحِ علویہ

روحِ علویہ سے ہماری مراد دراصل انسان کا علم کی جانب میلانِ خاص ہے۔ روحِ علویہ در حقیقت طلبِ حق کی جانب قدمِ اول ہے۔ انسان کا یہ مقام ایک عام سطح سے بلند اور طلب آمیز ہوتا ہے اسی مقام پر انسان شعور کی جانب بڑھنے لگتا ہے۔ روحِ علویہ کا حامل اشیاء کی حقیقت جاننے کے درپے ہوتا ہے طبع اور مابعد الطبع کی جانب ایک لاشعوری میلان روحِ علویہ کا خاصا ہے۔ لاشعوری میلان اس لئے کہ جب تک معرفتِ مطلق تک رسائی نہیں ہو جاتی ہے انسان کے لفظ وخیال اور افعال محض لاشعوری کاوش ہی ہوتے ہیں۔ گویا شعور کی طرف بڑھتے ہوئے ایک لاشعوری جدوجہد درحقیقت روحِ علویہ کا ماحصل ہے۔ روحِ علویہ کا حامل یقیناً عارف نہیں ہوتا لیکن یہ عارف بھی نہیں ہوتا۔ اگر روحِ علویہ کا حامل سفرِ معرفت جاری رکھے تو آگے بڑھ سکتا ہے کیونکہ روح ہمیشہ ارتقائی مراحل طے کر کے ہی آگے بڑھتی ہے۔ مادہ اور حیات کا ارتقاء ممکن نہیں لیکن روح کا ارتقاء جاری وساری رہتا ہے۔ صحت مند ارتقاء کیلئے جہدِ مسلسل ضروری ہے۔ بغیر جہدِ مسلسل کے روح جامد تو نہیں رہتی لیکن سفر کی رفتار خاصی سست ہو جاتی ہے ممکن ہے کہ وصفیہ کا حامل علویہ تک پہنچ جائے لیکن عین ممکن ہے کہ اُسے پہنچتے پہنچتے چار عشرے لگ جائیں، البتہ جہدِ مسلسل کی بنیاد پر یہ سفر اپنی ایک مخصوص رفتار سے جاری رہتا ہے۔ مدارجِ روح ہر دور میں فروعی تبدیلی

کے ساتھ قریباً یہی رہیں گے البتہ عارفین کرام مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تعیینِ مدارج اور متصوفانہ اصطلاحات میں جدّت و نیرنگی لاتے رہیں گے۔

روحِ عرفیہ

ایک سعید روح جو معرفت کی حامل اور حق کی پرتو ہوتی ہے۔ انسان جب عام سطح سے بلند ہوتا ہوا علم کی وادیوں میں قدم رکھتا ہے تو موجودات کی پرکھ اُسے اصل کی جانب لارہی ہوتی ہے۔ اخلاص اور استقلال ہو تو جلد ہی انسان روحِ عرفیہ تک پہنچ جاتا ہے۔ ذاتِ خداوندی کا کماحقہ ادراک دراصل روحِ عرفیہ کہلاتا ہے۔ روحِ عرفیہ تک پہنچنے کا عمل کرب آمیز اور زبردست عزم کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ دنیا و مافیہا میں سے سب سے بہترین عمل در حقیقت ذاتِ حق کا ادراکِ مطلق ہے۔ اگر یہاں تک رسائی ممکن ہو جائے تو انسان کیلئے اس سے بڑی سعادت کوئی نہیں لیکن یہاں تک پہنچنا غیر معمولی جہد کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک انسان کیلئے اس سے بہتر عمل کونسا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خالق کا شعوری ادراک حاصل کر لے اور وہ یہ جان لے کہ وہ خالق کے ساتھ کس طرح مربوط رہ سکتا ہے۔ انسان موجودات کی حقیقت معلوم کرنے کیلئے پوری زندگی بے چین رہتا ہے اور اس کیلئے حتی الوسع اپنے تمام تر حسی و طبعی ذرائع بھی استعمال کرتا ہے لیکن وہ ذات جو سب سے بڑھ کے قابلِ درک ہے، وہ بہ نسبت ادراکِ موجودات کے اس امر کی زیادہ حقدار ہے کہ اُس کی معرفت حاصل کی جائے اور اُس کو جاننے کیلئے سفرِ حق اختیار کیا جائے۔ جو لوگ یہ سعید عمل سرانجام دیتے ہیں اُن کیلئے ذاتِ حق کی معیت لازم ہو جاتی ہے چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"والذین جاھدو ا فینا لنھدینھم سبلنا"

ترجمہ: "وہ لوگ جو ہماری راہ میں مجاہدہ (ریاضت) کرتے ہیں ہم اُنہیں ضرور ہدایت کی راہ دکھاتے ہیں۔"

آیتِ کریمہ میں جہد سے مراد دراصل معرفتِ حق کیلئے مسلسل ریاضت ہے۔ اسی بنیادی نکتہ کی طرف حجت الاسلام حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے واضح اشارہ فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں:

"بغیر ریاضت کے روح کی حقیقت جاننا ممکن نہیں چنانچہ معرفت تک پہنچنے کیلئے مسلسل ریاضت لابدی ہے۔"

روحِ لطفیہ

معرفت کے بعد مقامِ لطف شروع ہوتا ہے۔کوئی بھی عارف جب ذاتِ حق کی کماحقہ معرفت حاصل کر لیتا ہے تو پھر وہ ہمہ وقت غلبہ حال میں مبتلا رہتا ہے گویا جمالِ یار پوری آب وتاب کے ساتھ اُس میں حلول کر چکا ہوتا ہے۔روح کا یہ رُتبہ عرفان کی انتہاء ہے کیونکہ عرفان عارف کو قدم قدم پر سامانِ حیرت مہیا کرتا ہے۔ اس لئے عارف اس مقام پر نطق و دلیل سے یکسر بے بہرہ ہو جاتا ہے گویا اس مقام پر اُس کیلئے علم کوئی اہمیت رکھتا ہے نہ معرفت بلکہ ذاتِ حق میں فنا ہو کر وہ ہمہ وقت سرور میں رہتا ہے۔علم کی انتہاء دراصل جمالیات کی ابتداء ہے کیونکہ علم ناقص اور لطف کامل ہے۔روحِ لطفیہ کا حامل مروجہ ضوابط سے ماوراء اور ہمہ وقت بے خود و سرمست رہتا ہے گویا اُس کیلئے علم و نظم سے زیادہ لطف اہمیت رکھتا ہے اور سچ بھی یہی ہے کہ ادراکِ حق کے بعد لطف ہی تکمیلِ ذات کا واحد ذریعہ ہے لیکن یہاں تک پہنچنا آسان نہیں، زبردست ریاضت کے بعد کہیں جا کے ایک عارف اس مقام تک پہنچتا ہے۔روحِ لطفیہ کے حامل کا ادراک تحلیل ہو کر جنوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے چنانچہ لطفیہ کا حامل جنوں کے باعث مقتل کی جانب روانہ ہو جاتا ہے یا پھر وجد و سرور کی جانب، بہت کم حاملین لطفیہ دار کی جانب گئے، عارفین کی اکثریت عرفیہ سے آگے نہ بڑھ سکی اور اسی میں غوطہ زن رہی، جو بھی آگے بڑھے اُنہوں نے دو میں سے ایک ہی راستہ اپنایا، وجد و سرور یا پھر لطفِ دار، حضرت حسین ابن منصور، شہاب الدین سہروردی اور حضرت سائیں بلھے شاہ رحمہ اللہ علیہم جیسے مقدس نفوس اصحابِ دار ٹھہرے جبکہ سیدی و مرشدی حضرت رومی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت امیر خسرو رحمہ اللہ علیہم جیسی نابغہ روزگار ہستیاں وجد و سرور پر مقیم رہیں۔

نفس

نفس دراصل روح کے منفی جوہر کو کہتے ہیں۔ نفس کو عام انگریزی اصطلاح میں (Spirit) کہا جاتا ہے لیکن اسکے اطلاقی پہلو کو عمومی طور پر شہوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شہوت کیلئے انگریزی میں (Lust) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ لغوی اعتبار سے Lust کے مفہوم میں ہر قسم کے منفی انسانی رویہ کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ روح محبت اور نفس شہوت ہے چنانچہ انگریزی میں اس اختلاف کو کچھ یوں بیان کیا جائے گا۔

Love is an intense feeling of affection and care towards another person. It isa profound and caring attraction. On the other hand, lust is a strong desire of a bodily nature.

انسانی روح کے اس منفی جوہر پر براہِ راست شیطان کا اثر ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ

"الم اعهد اليكم يا بنی آدم ان لا تعبدو الشيطان ، انه لكم عدو مبين

" اولادِ آدم کیا ہم نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لیا تھا کہ خبردار شیطان کی عبادت نہ کرنا بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

اسی طرح ایک روایت میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا پُتلا بنایا تو شیطان اُس پتلے کے منہ میں داخل ہو کر اُس کے دُبر کے راستے سے باہر نکل گیا اور کہنے لگا کہ تیری کوئی حیثیت نہیں اگر مجھے تجھ پر قبضہ و تصرف دیا گیا تو میں تجھے ہلاک کر دوں گا۔ چنانچہ نفس انسان کو ہمیشہ بُرائی کی جانب لگائے رکھتا ہے اور یہی انسان

کا شیطانی رویہ ہے۔نفرت ،غصہ، بُرائی ، ہوس ،حرص ،تکبر ،زیادتی اور اس طرح کے تمام منفی انسانی رویے (شہوات) دراصل نفس کی ہی دین ہیں ۔مادی سائنس انسان کی خواہشات کو دوام بخشنا چاہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر سائنس کے طلبہ نفس کے دھوکہ میں مبتلا ہو کر مطلق آزادی کے عذاب سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ مطلق آزادی انسان کیلئے عذابِ مسلسل سے کم نہیں۔معروف مغربی وجودی فلسفی محترم ژان پال سارتر نے اپنے ایک خطبہ میں کہا تھا کہ "انسان کو آزادی کی سزا ملی ہے اور آزادی سے مُراد دراصل نفس کی پیروی کرنا ہے۔نفس کی پیروی ہی انسان کو گوناں گوں مسائل سے دوچار کرتی ہے ۔نفس کی پاکیزگی کیلئے سب سے بہترین ضابطہ کیا ہے اس پر ہم شریعت کے باب میں بحث کریں گے۔سرِ دست یہ عرض کرنا مقصود تھا کہ انسانی روح کا منفی پہلو یعنی نفس انسان کو مختلف برائیوں کی جانب دھکیل دیتا ہے، اسی کو قرآن نے نفسِ امارہ سے تعبیر کیا ہے۔چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"ان النفس لامارة بالسوء"

"اور نفس تو بلاشبہ بُرائی کا حکم دینے والا ہے۔"

نفس یعنی یہ منفی جوہر انسان پر غلبہ پالے تو وہ شہوات کا قیدی اور بُرائیوں کا تابع ہو جاتا ہے اس کا دل تمام اچھی باتوں سے خالی ہو جاتا ہے۔جس نے بھی اپنے اعضاء کی زمین کو شہوات کا پانی دیا اُس نے ہمیشہ شرمندگی کی فصل کاشت کی شہوات بادشاہ کو مفلس اور صبر فقراء کو بادشاہ بنا دیتا ہے۔ایک صوفی دانشور نے نفس کے دھوکہ کو اشعار میں کچھ یوں پرو دیا:

انی ابتلیت باربع وما سلطوا
الا لشدة شقوتی و عنائی
ابلیس والدنیا ونفسی والھوی
کیف الخلاص وکلھم اعدائی

داری الھویٰ تدعو الیہ خواطری

فی ظلمۃ الشھوات والاراء

مفہوم اس کا یہ ہے کہ ''مجھے ان چار دشمنوں نے گھیر رکھا ہے جو بدقسمتی سے میرے برے رویے کے سبب مجھ پر غلبہ پا چکے ہیں۔ ابلیس، دنیا، نفس اور خواہشات، ان سے مجھے کیسے خلاصی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ چاروں میرے دشمن ہیں میں دیکھتا ہوں کہ نفسانی خواہشات مجھے اپنی طرف بلاتی ہیں اور شہوات ولذات کے تاریک گڑھے میں ڈال دیتی ہیں۔''

حدیثِ پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''افضل ترین جہاد اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔''

اپنے نفس کے ساتھ جہاد سے مُراد دراصل منفی رویہ کو لگام دینا ہے۔ اسکی تہذیب کرنی ہے خواہش فی نفسہ بُری چیز نہیں ہے لیکن خواہش کو خدا بنالینا بُرا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''افرایت من التخذ الھہ ھواہ''

''کیا آپ نے اُس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو خدا بنالیا ہے۔''

خواہش کی تزئین وتحدید کی جاسکتی ہے اور اس میں سے موجود آلائش کو بھی دور کیا جاسکتا ہے لیکن اس جانب آنے سے پہلے ذیل میں ہم نفس کے چار مدارج اور اُن کی تفصیل بیان کرتے ہیں:

نفسِ ضراریہ

نفسِ ضراریہ دراصل انسان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا نام ہے چنانچہ اس میں کھانا پینا، سونا اور جنسی ضرورت وغیرہ شامل ہیں۔ نفسِ ضراریہ کے لحاظ سے انسان اور کسی بھی جاندار میں کوئی فرق نہیں، ہر جاندار نفسِ ضراریہ کا حامل ہوتا ہے اور اس کے بغیر چارہ بھی نہیں کیونکہ ضراریہ ہر جاندار کی مطلق بقاء کا ضامن ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر جاندار کا جبلی تقاضا دراصل نفسِ ضراریہ کہلاتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی انسان کبھی نفس کے اس بنیادی جوہر سے منزہ نہیں ہوسکتا، روحِ

وصفیہ کی طرح نفسِ ضراریہ بھی انسان کی بنیادی کیمیاء ہے جس سے کسی بھی صورت چھٹکارہ ممکن نہیں۔ مادہ اور حیات کی بقاء نفسِ ضراریہ کی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر کوئی انسان کھانا پینا وغیرہ چھوڑ دے تو اُس کا زندہ رہنا محال ہو جائے گا، مقدار کے معاملہ میں تخفیف ممکن ہے لیکن بہر حال کھانا تو پڑے گا کیونکہ یہ مادہ اور حیات کی بنیادی اکائی ہے۔ گویا مادہ اور حیات کی ترکیب نفسِ ضراریہ کی بنیاد پر قائم ہے بلکہ مادہ اور حیات کو توانائی بخشنے والی کیمیاء ہی دراصل نفسِ ضراریہ ہے۔ نبی، ولی، صوفی، مجذوب اور سادھو کوئی بھی انسان نفسِ ضراریہ سے فرار نہیں حاصل کرسکتا کیونکہ یہ انسان کے بنیادی عناصر کی نمو کرتا ہے چنانچہ نفسِ ضراریہ کی تکمیل میں کوئی شرعی قباحت ہے نہ منطقی، خرابی اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان نفسِ ضراریہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر انسان اسی مقام پر قناعت کرلے تو اُس کیلئے تسکینِ مسلسل کا حصول عین ممکن ہے۔

نفسِ کباریہ

ضروریاتِ حیات کی تکمیل میں کوئی قباحت نہیں بلکہ اس کی تحسین کی گئی ہے۔ مسئلہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنے نفس کو دوسرے نفوس سے برتر تصور کر کے ضرویات کو بڑھاوا دے کر معاشرہ میں نمایاں کر دیتا ہے تاکہ دوسرے لوگ لامحالہ اِس کی عظمت کا اعتراف کریں، تو یہی سب سے اہم خرابی ہے۔ اسی سے بچنے کیلئے قرآن نے زبردست نصیحت فرمائی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وکلوا واشربوا ولا تسرفوا"

"کھاؤ اور پیو لیکن حد سے نہ بڑھو۔"

نفسِ کباریہ انسان کو استکبار کے ذوقِ سوء میں مبتلا کر کے بُرائی کو مزین کر دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "واذ زین لھم الشیطان اعمالھم"

"اور جب شیطان نے اُنکے اعمال اُن کو مزین کر دکھائے۔"

اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنا دراصل نفسِ کباریہ ہے، عموماً اس جانب توجہ نہیں دی

جاتی اور لاشعوری طور پر انسان استکبار میں مبتلا ہو جاتا ہے جو بلاشبہ انتہائی خطرناک فعل ہے۔ حدیثِ پاک میں ہے کہ "وہ شخص کبھی جنت نہیں جا سکتا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا۔" استکبار ایک ایسی متعدی بیماری ہے کہ جس کے لاحق ہونے سے انسان ہر قسم کی اخلاقی برائی میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ پہلے پہل تو استکبار بہت لذیذ معلوم ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے انسان نفسِ کباریہ میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو ہر قسم کی روحانی اذیت بھی اس کا مقدر ٹھہرتی جاتی ہے۔

نفسِ رذالیہ

استکبار تمام برائیوں کی جڑ اور اخلاقی قباحت کی پہلی سیڑھی ہے جیسے انسان اس سیڑھی پر قدم رکھتا ہے تو برائی کی کشش اُسے اپنے حصار میں لے لیتی ہے اس مقام پر وہ اپنی عظمت کو دوسروں پر منوانے کیلئے ہر قسم کی حد پار کرنا گویا اپنا فرض سمجھتا ہے، شعوری طور پر ہو یا لاشعوری طور پر، بہر حال انسان مقبرہِ استکبار کو کسی بھی صورت منہدم نہیں ہونے دیتا کیونکہ اسکی لذت اُسے مزید بُرا کرنے پر آمادہ کرتی ہے حتیٰ کہ انسان رذالت کے گڑھے میں پوری طرح گر جاتا ہے۔ استکبار کو قائم رکھنے کیلئے انسان ہر برائی کو سرانجام دینے کیلئے تیار رہتا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ اُس کے اس فعل سے کسی کو کس حد تک تکلیف یا نقصان ہو رہا ہے۔ حقوق العباد اور حقوق اللہ سے لاپرواہ نفسِ رذالیہ کا حامل اپنے نفس کی پیروی میں ہمہ وقت سرگرداں رہتا ہے۔ روح وصفیہ کو سیاہ کرنے کے بعد اس کیلئے ہر برائی گویا اچھائی بن جاتی ہے۔ رذالیہ نفسِ انسانی کی پستی کا آخری درجہ ہے اس کے بعد انسان شرفِ انسانیت سے بھی گر جاتا ہے۔

نفسِ شیطانیہ

بُرائی کی دلدل میں دھنسا ہوا انسان اس درجہ میں شرفِ انسانیت سے گر کر چوپائیوں کی سطح پر آجاتا ہے بلکہ اس سے بھی گیا گزرا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"ان هم الا کالانعام، بل هم اضل سبیلا"

""بلاشبہ وہ تو چوپائیوں کی مانند ہو چکے بلکہ اُن سے بھی بدتر۔""

نفسِ شیطانیہ کا حامل بھلائی کا ارادہ تو در کنار بھلائی کے متعلق سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کی خیر اور صلح سے مبراء ہو جاتا ہے، نفسِ شیطانیہ زمین پر سرکشی کا انتہائی درجہ ہے۔ نفسِ شیطانیہ کا حامل اپنے نفس کو خدا کے مقابلہ میں لے آتا ہے اور انسانیت پر ظلم و بربریت کو اپنا حق سمجھتا ہے جیسا ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "فقال ان ربکم الاعلیٰ"

""اور اُس نے (فرعون) نے کہا کہ میں ہی تمہارا بلند و بالا رب ہوں۔""

انسان کی سطح سے گر کر نفسِ شیطانیہ کا حامل انسان کے روپ میں شیطان ہوتا ہے جس کا کام انسانیت کا استحصال اور اپنے نفس کو تسکین پہنچانا ہوتا ہے۔ نفسِ شیطانیہ کے حامل سے کسی قسم کی خیر کی توقع رکھنا عبث ہے کیونکہ اسے خیر و صلح سے نفرت اور برائی سے لگاؤ ہو جاتا ہے جس کے باعث خیر کی بات بھی اس کو ڈستی ہے۔ ہر نفسِ امارہ کی اصلاح ممکن ہے لیکن نفسِ شیطانیہ کی اصلاح ممکن نہیں نفسِ شیطانیہ سے نجات حاصل کرنے کیلئے اس کا قلع قمع کرنا ہی ضروری ہوتا ہے۔

تہذیب النفس

تہذیب دراصل مذہب سے ہے اور مذہب عربی زبان میں کسی طرف رُخ کرنے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں کسی مخصوص اور متعین ضابطہ کی پابندی مذہب کہلاتی ہے۔ علاوہ ازیں تہذیب کے اصطلاحی معنی خوبصورتی میں بھی آتے ہیں چنانچہ یہاں پر تہذیب سے مراد خوبصورتی ہے۔ نفس کے متعلق تو ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں۔ تہذیب النفس سے ہماری مراد دراصل روح کے منفی جوہر کی تزئین ہے۔ اسی کو عام انگریزی اصطلاح میں (Purification of soul) کہا جاتا ہے یعنی روح کے منفی جوہر کی تزئین کرنا، اُس کے اندر موجود آلائشوں کو دور کرنا۔ واضح رہے کہ کوئی بھی چیز یا عمل فی نفسہ یعنی اپنے اصل کے اعتبار سے بُرا نہیں ہوتا۔ یہ دراصل اُس کا سیاق وسباق ہے جو اُسے بُرا بنا دیتا ہے چنانچہ نفس اپنے اصل کے اعتبار سے بُرا نہیں بس اس کو سطحی آلائشوں سے دور کرنا ہوتا ہے۔ اسی کو قدیم صوفیانہ اصطلاح میں تزکیہ نفس کہا جاتا رہا ہے۔ نفس کی پاکیزگی سے مُراد ہر قسم کی بُرائی سے دور ہو جانا، یہی علم و تعلیم کا مقصد ہے۔ علم کی غرض وغایہ محض تہذیب النفس ہے۔ آج ہمیں تہذیب النفس کی اشد ضرورت ہے۔ ہماری جدید علم و تحقیق ہمیں تہذیب النفس سے لاشعوری طور دور لے جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے سماج میں انسانی رویہ دن بدن اضمحلال کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ ہم ظاہری وضع قطع پر تو ہر لحاظ سے خوب توجہ دے رہے ہیں لیکن ہم نے اپنے باطن پر توجہ دینا قریباً ترک دیا ہے۔ حالانکہ اہمیت باطن کو حاصل ہے چنانچہ حدیثِ پاک میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور شکلوں کو نہیں دیکھتے بلکہ دلوں اور اعمال کو دیکھتے ہیں۔"

گویا اصل الاصول نیت اور عمل ہے اسی نیت اور عمل کی پاکیزگی کیلئے اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سلسلہ جاری فرمایا، دنیا کے بیشتر مذاہب میں ایک بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر گناہگار ہے لیکن اسلام نے اس باطل عقیدے کی جو گمراہ کن بھی ہے اور شرف انسانیت کے منافی بھی، تردید کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسان کے بارے میں اپنا یہ اصول قرآن پاک میں بیان فرمایا ہے:

"لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم"

"ہم نے ہر لحاظ سے انسان کو بہترین پیمانے پر تخلیق کیا ہے۔"

سورہ الشمس میں اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی دیگر مخلوقات کو اپنی ربوبیت پر گواہ کے طور پر بیان کیا اور ان کی قسم کھائی اس میں نفس انسانی کی استواری اور سلامتی کو بھی شامل فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے:

"ونفس و ما سوھا"

"اور قسم ہے نفس انسانی کی اور اس کو استوا کرنے والی ذات کی۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا نفس حقیقت میں ایک بے غبار آئینہ ہے، لیکن زندگی کے تقاضے اور اس کے مسائل جوان گنت، بے شمار اور مختلف النوع ہیں، ان کی تکمیل کی تگ ودو انسان کو ہمہ وقت اس گرد و غبار کے زیر اثر رکھتی ہے جو اس آئینے کو گدلا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی شعوری زندگی کے ہر لمحے میں تین قسم کے حقوق ادا کرتے رہنے کا پابند ہے، یعنی حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق نفس۔ کار دنیا کی انجام دہی کی اس تگ ودو میں آدمی ان تینوں قسم کے حقوق کی ادائیگی میں وہ توازن قائم نہیں رکھ سکتا جو اگر قائم رہے تو آئینہ دل کی صفائی میں فرق نہیں آسکتا۔ یہ فضیلت صرف انبیائے کرام علیہم السلام کے حصے میں آئی ہے۔ درحقیقت حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق نفس میں کوتاہی آئینہ دل کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ دل کی اس صفائی کا ہر وقت خیال رکھنا اور شعوری یا لاشعوری کوتاہی کی وجہ سے اس پر آجانے والے داغ دھبوں اور کدورت کو

صاف کرتے رہنا تزکیہ نفس ہے اور نفس کو کدورتوں سے صاف رکھنے کا یہ عمل اللہ کے نزدیک حصولِ فلاح کا ضامن ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"قد افلح من زکھا"

"اللہ کا ہر وہ بندہ فلاح سے ہم کنار ہوا جو اپنے نفس کا تزکیہ کرتا رہا۔"

سورہ الشمس ہی میں اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ اس نے اس کو نیکی اور برائی میں تمیز اور فرق کرنے کی صلاحیت سے بھی مالا مال فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"فالھمھا فجورھا وتقوھا"

"پھر اُس نے اسے نیکی اور بدی کی تمیز سمجھا دی۔"

اسی خداداد صلاحیت کا اثر ہے کہ آدمی جب اللہ کے بندوں کے حقوق کی ادیگی میں کوئی کوتاہی کرتا ہے، کسی پر کوئی ظلم دانستہ یا نادانستہ کر بیٹھتا ہے یا اس سے کوئی ایسا قول یا فعل سرزد ہو جاتا ہے جو اللہ کے کسی بندے کی دل آزاری کا سبب ہو تو اس کے دل پر ایک غبار سا چھا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو رسول اللہ ﷺ نے گناہ کی اس تعریف کے ذریعہ سے سمجھایا ہے:

"الاثم ماحاک فی صدرک"

مطلب یہ کہ "گناہ ایک سلیم القلب فرد کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔"

اسلام کی تعلیمات یعنی قرآن حکیم کی آیات اور رسول کریم ﷺ کے ارشادات سے ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو شخص اس طرح اپنے ضمیر کی خاموش آواز کو سنتا اور اس گناہ کی تلافی کی کوشش کر لیتا ہے تو اس کا نفس گناہ کی کثافت سے پاک ہو جاتا ہے، دل کے آئینے کو ہر گناہ سے، خواہ اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو خواہ حقوق العباد یا حقوق نفس سے، پاک کرنے کی کوشش تزکیہ نفس ہے، ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کا نفس شعوری اور لاشعوری طور پر غلطیوں، کوتاہیوں اور بے احتیاطیوں کی وجہ سے مکدر ہوتا رہتا ہے۔ نفس کی اس خرابی پر متوجہ رہنا اور اس کی صفائی سے غفلت نہ برتنا ہی تزکیہ نفس ہے۔ یہ عمل اللہ کی نظر میں اس قدر اہم ہے کہ اسے انبیائے کرام علیہم السلام

کے فرائض منصبی میں شامل فرمایا گیا ہے اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو ان طریقوں کی خصوصی طور پر تعلیم دی ہے جو تزکیہ نفس کے لیے ضروری ہیں۔ آپ ﷺ کی تعلیمات اور ہدایات پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان جو کوتاہیاں اور غلطیاں حقوق اللہ کے بارے میں کرتا ہے، اُن کی تلافی اور ان کے برے اثرات کو نفس سے دور کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی اللہ سے معافی مانگتا رہے۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کا یہ عمل استغفار کہلاتا ہے جس کے بارے میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''میں دن میں ستر سے زیادہ بار استغفار کرتا ہوں۔'' لیکن جہاں تک حقوق العباد کے سلسلے میں ہونے والی غلطیوں، کوتاہیوں اور خطاؤں کا معاملہ ہے تو یہ کام ضرورت اور افادیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حقوق العباد کو اس وقت تک معاف نہیں فرماتا جب تک متاثر ہونے والے فرد سے حساب صاف نہ کرلیا جائے۔ ایک انسان کے کسی غلط طرز عمل، کسی ناروا سلوک یا کسی زیادتی سے کبھی تو ایک یا چند افراد متاثر ہوتے ہیں اور کبھی ان اثرات کا دائرہ بڑھ کر معاشرے، قوم، ملک اور بسا اوقات ساری انسانیت تک جا پہنچتا ہے چنانچہ اسی مناسبت سے نفس کی کدورت میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی تناسب سے تزکیہ نفس کا کام مشکل تر ہو جاتا ہے۔ اس لیے دوسروں کو اپنے ہاتھ، زبان، قلم، قوت وصلاحیت کے غلط استعمال اور افکار واعمال کی خرابیوں کے برے اثرات سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ تزکیہ نفس کا عمل صرف نفس کے آئینے سے اس گرد وغبار کو صاف ہی نہیں کرتا بلکہ آدمی میں اس ضرورت کا احساس بھی پیدا کرتا ہے کہ اسے اپنی آئندہ زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو دوسروں کے لیے حق تلافی یا ان پر ظلم وزیادتی کا موجب ہو اور اس کے نتیجے میں اس کے اپنے نفس کو بھی داغدار کردے۔ اس سے واضح ہوا کہ تزکیہ نفس کے سلسلے میں اللہ کے رسول ﷺ نے جو ہدایات فرمائی ہیں ان پر مسلمان افراد اور مسلمان معاشرے دونوں کو کاربند رہنا چاہیے تاکہ اس طرح ہم اُس قلب سلیم کے حامل بن سکیں جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو مطلوب اور محبوب ہے۔

شریعت

شریعت عربی زبان میں گھاٹ کو کہتے ہیں جبکہ عام اصطلاح میں اُن اُلوہی ضوابط کو کہا جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمارے پاس لاتے رہے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمته"

"اور خدا نے انہی میں سے ایک رسول بھیجا تا کہ ان کو خدا کی آیتیں پڑھ کے سنائے ان کے نفوس کی تہذیب کرے اور حکمت کی تعلیم دے۔"

چنانچہ ثابت ہوا کہ شریعت کا مقصدِ اصلی تہذیب النفس ہے۔ ہمارا مطمح چونکہ تہذیب النفس ہے اس لئے ہم شریعت کے ماخذ پر بحث نہیں کریں گے۔ آج اُمتِ مسلمہ مختلف جماعتوں میں منقسم ہوگئی ہے لیکن اصل الاصول تمام کا ایک ہی ہے یعنی تہذیب النفس۔ ہر جماعت پوری دیانتداری سے شریعتِ محمدی پر عمل پیرا ہے کسی بھی مکتبہ پر تنقید کی گنجائش موجود نہیں کیونکہ حدیث پاک میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میری اُمت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی اور ہر جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔"

اُمتِ مسلمہ کو سیادتِ عالم کی ذمہ داری سونپ دی گئی اس لئے ان کا باہم اور دیگر مذاہب سے مناظرہ ومجادلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اُمتِ مسلمہ ایک ثالث اُمت ہے اسے تمام عالم کی منصف اُمت قرار دیا گیا چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''و کذلک جعلنا کم امه وسطا لتکونو شهداء علی الناس''

''اور ہم نے تمہیں اُمتِ ثالثہ بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو۔''

علاوہ ازیں کسی بھی مسلمان کے پاس کسی دوسرے مسلمان کی تکفیر و تضلیل کا اختیار موجود نہیں حدیثِ پاک میں ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لا الہ الا اللہ کہنے والوں کی گناہوں کی وجہ سے تکفیر مت کرو اور اُن پر شرک کی تہمت نہ لگاؤ۔''

دوسرے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اہلِ قبلہ میں سے کسی کو گناہ کے سبب کافر نہ کہو اگرچہ وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کیوں نہ ہو''۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمادیا کہ ''لا الہ الا اللہ کہنے والوں سے دستبردار ہو جاؤ۔''

اسلام نے ہمیشہ امن وسلامتی کا پیغام دیا، اسلام کے معنی ہی سلامتی کے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ'' ان الدین عند الله الاسلام''

''اور اللہ کے نزدیک تو دین صرف اسلام ہی ہے۔'' اور اسلام سے مُراد مطلق سلامتی ہے۔ دینِ اسلام میں جبر کا تو دور دور تک سوال نہیں پیدا ہوتا ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ''لا اکراہ فی الدین''

''دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔'' آج بعض مسلمانوں کے منفی رویہ کی وجہ سے دینِ اسلام کو متہم نہیں کیا جا سکتا اسلام نے تو ہر دین کے پیروکاروں کو اپنے دین پر عمل کی مکمل آزادی فراہم کی ہے چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ'' لکم دینکم ولی الدین''

''آپ کیلئے آپ کا دین اور میرے لئے میرا دین۔''

اسلام نے تو غیر مسلموں کی تکفیر سے بھی منع کر دیا قرآن کے مطابق تمام غیر مسلموں کو اُن کے نیک اعمال کا صلہ دیا جائے گا:

''ان الذین امنو والذین هادو والنصاری والصابئین من آمن بالله والیوم الاخر وعمل صالحا فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون''

’’ جولوگ بظاہر ایمان لائے ، یہود و نصاریٰ اور مختلف ادیان کے حاملین جس کسی نے بھی خدا اور آخرت پر یقین رکھا اور نیک اعمال کیئے، اُس کیلئے اللہ کے ہاں اجرِ عظیم ہے۔ اُنہیں نہ کوئی خوف ہے اور نہ غم۔‘‘

آیتِ مذکورہ میں صاف اور دوٹوک اسلوب سے فرمادیا گیا کہ اصل الاصول ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ ہیں۔ گویا جو کوئی بھی نیک اعمال سرانجام دے گا، اُس کو اپنے عمل کا صلہ ضرور ملے گا۔ دینا کے ہر مذہب نے تہذیب النفس کی تعلیم دی ہے۔

یہاں یہ بات اہم ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد تہذیب النفس ہے۔ ہر مذہب نے نیکی کا پرچار کیا چنانچہ کسی بھی مذہب پر تنقید کا اختیار دنیا کے کسی بھی انسان کو حاصل نہیں۔ شریعت کے زُمرے میں صرف اس قدر کہنا اہمیت کا حامل ہے کہ ہر مسلمان کو اپنے مسلک کے مطابق جس میں اُس نے آنکھ کھولی، عقائد پر گرفت رکھے اور عبادات کی پابندی کرے، شر و فتن سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ کسی بھی مسلک کے خلاف نہ تو ہرزہ سرائی کی جائے اور نہ ہی اپنا مسلک چھوڑ کر کسی دوسرے مسلک میں ہمدردیاں تلاش کی جائیں کیونکہ اس رویہ سے پھر ایک تقابلی فضاء پیدا ہو جاتی ہے اور پھر ایک لامتناہی مناقشہ شروع ہو جاتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ احکامِ خداوندی کی تابعداری کیلئے اپنے اُس مسلک کی پیروری کی جائے جس میں ایک مسلمان آنکھ کھولتا ہے کیونکہ اسلام کے تمام مکاتب مبنی برحق ہیں کوئی بھی جماعت نہ تو گمراہ ہونا چاہتی ہے اور نہ ہی دوزخ کا ایندھن بننا چاہتی ہے۔ اس لئے ہمیں منکسر المزاجی اور تحمل کا ثبوت دینا چاہیے کسی بھی مسلک کی تکفیر یا تضلیل کرنا جائز نہیں جب تک کہ اُس کے حامل زبان سے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرتے رہیں۔ بالفرض اگر کسی مسلک کے حاملین کسی دوسرے مسلک کے حاملین کو گمراہ بھی سمجھتے ہیں تو اُن کے مواخذہ سے دور رہیں کہ یہ حق صرف اور صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے۔ رائے قائم کرنے اور اختلاف کرنے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے لیکن فیصلہ کرنے کا حق کسی انسان کو حاصل نہیں۔ یہ مطلق اللہ تعالیٰ کا حق ہے، باہم تکفیر و تضلیل پوری اُمت کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے جس کے نتیجہ میں باہم علمی فساد اور

گروہ بندی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔اس لئے کسی بھی صورت میں اہلِ اسلام کی تکفیر و تضلیل سے یکسر گریز کیا جائے اور کسی بھی مسلک کے حاملین کے علمی اختلاف کو ذاتی عناد پر محمول نہ کیا جائے بلکہ نہایت شائستگی سے خاموشی اختیار کر لینی چاہیے۔ اگر اختلاف یا تنقید کے بناء چارہ نہ ہو تو اختلاف میں حُسن اور کامل تہذیب کو مدِ نظر رکھنا چاہیے اور مقابل مسلک کی تمام تر علمی کوتاہیوں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے اپنے مسلک پر کاربند رہنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اُمت میں باہم نزع کی راہیں مسدود ہو جائیں۔

طریقت

طریقت کے لغوی معنی راستے کے ہیں جبکہ اصطلاح میں ایک مخصوص صوفیانہ اسلوب کو کہتے ہیں جس کے ذریعے انسان باطن کا تزکیہ کرتا ہے، اسی کو منازل سلوک بھی کہا جاتا ہے۔ شریعت انسان کے ظاہر کو مطہر کرتی ہے تو طریقت انسان کے باطن کو جلا بخشتی ہے۔ طریقت کو عرف عام میں تصوف بھی کہا جاتا ہے اور تصوف دراصل خدا کو دریافت کرنے یا دیکھنے کی شدید آرزو اور روح انسانی کو اپنی اصل سے واصل ہونے کے اشتیاق کا نام ہے۔ گویا تصوف دراصل نظری اور عملی اعتبار سے آفاقی حقائق جسے اعراض کئے بغیر کبریائی قوت اسکی رضا اور اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنا ہے۔ مشائخِ تصوف کے مطابق محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم کی حقیقت اور شرح وسط کا کام جد الاولیاء حضرت مولا علی ابن طالب کرم اللہ وجہہ "من کنت مولا فھذا علی مولا" "جس کا میں مولا ہوں اُس کا علی مولا ہے" ارشادِ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا تھا جسے بعد میں طریقت سے تعبیر کیا گیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس علم کی اشاعت اپنے چار خلفاء حضرت امام حسن، امام حسین، امام حسن بصری اور امام کمیل بن زیاد علیہم السلام کے ذریعے سے فرمائی اور انکے ذریعے پھیلنے والی روحانیت کو سلاسلِ طریقت کا نام دیا گیا۔ یہ سلاسلِ طریقت عرب سے نکل کر ایران اور ترکستان پہنچے اور پھر تصوف کے نام سے پوری دنیا میں پھیل گئے۔ چنانچہ ہمارے ہاں اس وقت طریقت کے چار معروف سلسلہ ہائے تہذیب موجود ہیں جن کو سلاسلِ اربع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کے

اسمائے مطہرہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ ہیں۔ ان تمام سلاسل میں عشقِ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد پر ایک مجذوب (شیخ کامل) کے ہاتھ پر بیعت کی جاتی ہے اور اپنے مُرشد کے دست میں دست دے کر یہ عہد کیا جاتا ہے کہ میں اپنے باطن کی اصلاح کروں گا اور اپنے نفس کو ہر بُرائی سے پاک کروں گا۔ یہ بیعت طبعی بھی ہوتی ہے اور روحانی بھی۔ طبعی سے مراد ایک انسان کسی بھی شخص کو جس پر اُسے کامل یقین ہو اپنا مُرشد مان کر اپنی اصلاح کا عہد کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں روحانی طور پر بھی یہ عہد کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کام بیعتِ طبعی کی نسبت زیادہ مشکل ہے۔ طریقت کیوں ضروری ہے اسکی توجیہ کچھ اس طرح ہے کہ ہر انسان بنیادی طور اپنے نفس کا غلام واقع ہوا ہے۔ انسان ہمیشہ وہی کام کرتا ہے جو اُسے پسند ہوتا ہے، چاہے اس میں اسکی بظاہر بھلائی ہو یا بُرائی، بعض اوقات انسان شعوری اور لاشعوری طور پر بھی بُرے اعمال سرانجام دے دیتا ہے جس کا بعد میں اسے پچھتاوا بھی ہوتا ہے۔ اس کیلئے بہترین شرعی عمل توبہ ہے۔ انسان فطرتی طور تو یہ شکن واقع ہوا ہے کیونکہ نفس ہمہ وقت اسکے تعاقب میں رہتا ہے۔ ایسے میں اس کا بچ نکلنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ ہمارے حققدمین صوفیائے کرام نے اصلاحِ نفس کا یہ اسلوب رائج کیا کہ کوئی بھی انسان اُس شخصیت کے ہاتھ پر کامل یقین کے ساتھ عہد کرلے کہ میں اپنے نفس کی اصلاح کروں گا تو ایسے عمل کو بیعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شخصیت صرف وہی جس پر انسان کو یقینِ کامل ہو، باطن کی اصلاح اصل اہمیت کی حامل ہے۔ ہمارے ہاں اکثر و بیشتر ظاہر پر کچھ زیادہ زور دیا جاتا ہے لیکن باطن کو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ صوفیائے کرام نے سلوک کی ترتیب کچھ اس طرح رکھی ہے۔ اول صحبت جو کہ علم و جذبہ اور عمل سے تعلق رکھتی ہے۔ شیخ کامل کی صحبت جذبہ بیدار کرتی ہے اور شیخ کے عمل کا اثر مرید کے قلب پر ہوتا ہے اور صحبتِ شیخ ہی علم کا باعث بنتی ہے۔ پھر شیخ جذباتِ لطیفہ کے بیدار کرنے کے لئے طالب کو اذکار جہر اور خفی تعلیم کرتا ہے اور بمطابق علم اس کو عمل پیدا ہونے کے لئے بھی ارشاد فرماتا ہے، کثرتِ ذکر جہر و خفی کے بعد اشغال متعددہ اور مراقبات و توجہات کثیرہ بتاتا ہے۔ ان سب معاملات کے پس پردہ کیا حقائق کارفرما ہوتے یہ شیخ

کامل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جب سالک ان پر عمل پیرا ہوتا ہے تو (تو بسبب عمل کرنے کہ یا عامل ہونے کہ) جان جاتا ہے پھر وہ بھی شیخ کامل بن جاتا ہے گویا یہ ایک عملی راہِ سلوک ہے جس کو وہی جان پاتا ہے جس نے عمل کیا ہو، مثلاً ایک شخص صرف پہلوانی کا علم بذریعہ کتاب اور آج کل بذریعہ Tutorial C.D. اور Techniques جان کر پہلوان نہیں بن جاتا بلکہ وہ پہلوان اس وقت کہلوائے گا جب تک وہ Exercise نہ کرے اور اکھاڑے میں اُتر کر پہلوانی کے داؤ پیچ ظاہر نہ کرنے اور آزمانہ لے۔ چنانچہ متصوفانہ علوم بھی ایسے ہی ہیں۔ یہ محض علم کی بات نہیں ہے بلکہ ریاضت سے حاصل ہونے والی صلاحیت ہے مگر اس میں عطاء و موہبتِ الٰہی و جذبہ حق کا شامل حال ہونا اشد ضروری ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے نہ بخشندہ

شیخ کامل کی صحبتِ مسلسل کے باعث سالک کا ایک طرف جذبہ بیدار ہورہا ہوتا ہے تو دوسری طرف نظرِ ارادت کے سبب سالک شیخ کے بیان کردہ اشغال و اوراد میں منہمک تزکیہ نفس کی جانب رواں دواں ہوتا ہے۔ حصولِ تزکیہ نفس کے بعد سالک شعورِ مطلق کی جانب بڑھتا ہے اور پھر شیخ کی نگرانی میں سفرِ تلاشِ حق کی ریاضت شروع کردیتا ہے۔

شیخِ کامل

صحبتِ مسلسل
طلوعِ جذبہ
شعورِ مطلق
ریاضت
سفرِ تلاشِ حق
نظرِ ارادت
اشغال و اوراد
تزکیہِ نفس
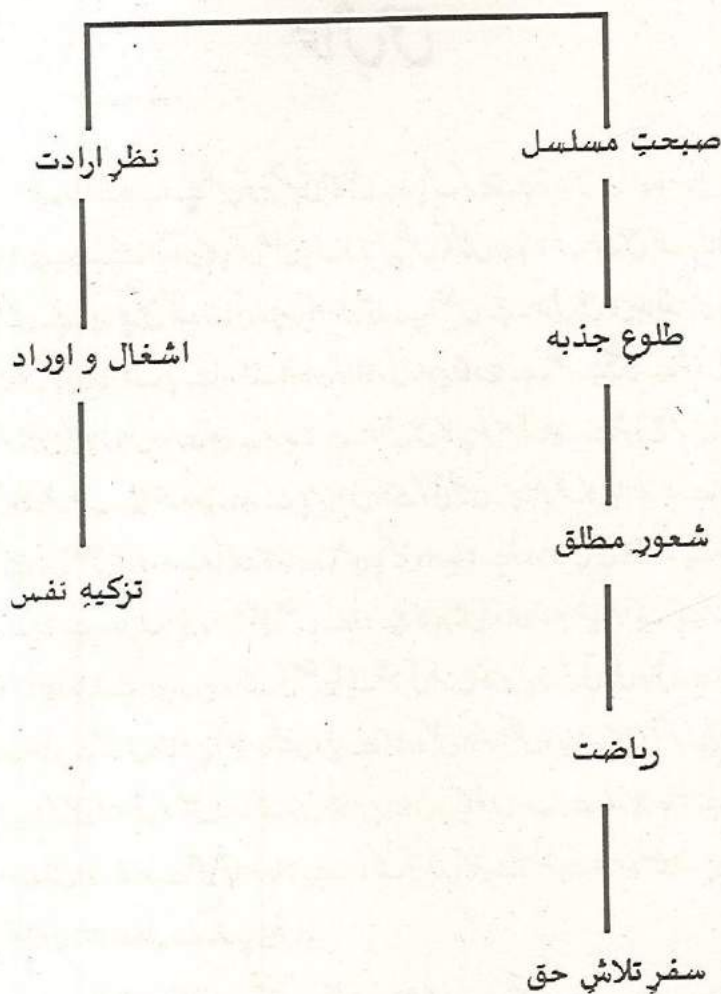
تلاشِ حق

ایک سالک جب اپنے نفس کو ہر قسم کی آلائش سے پاک کرلیتا ہے تو وہ حق کی راہ کا مسافر بن جاتا ہے۔ جب تک انسان کا باطن مکمل پاک (تزکیہ نفس) نہیں ہوجاتا تب تک حق تک رسائی ناممکن ہے۔ چنانچہ حق تک رسائی کا پہلا اُصول تہذیب النفس ہے۔ تلاشِ حق کا پہلا قدم نفی ہے کیونکہ علم کی بنیاد شک پر ہے اور شک انسان کو انکار کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ علم بے یقینی سے شروع ہو کر یقین کی لازوال دولت نصیب کر جاتا ہے۔ تلاشِ حق کا یہ سفر ہم کلمہ طیبہ سے شروع کریں گے کیونکہ کلمہ طیبہ سے مستند معیار ہمارے پاس اس وقت کوئی نہیں۔ چنانچہ کلمہ کا پہلا جز لا ہے اور لا کہتے ہیں مطلق نفی کو، جب سالک کا ظاہر و باطن پاکیزہ ہو جاتا ہے تو وہ تلاشِ حق کا آغاز پہلے ظاہر سے کرتا ہے۔ سالک اپنی روح یعنی عقل کے ذریعے ظاہر میں موجود تمام اشیاء کو ایک ایک کر کے توڑتا چلا جاتا ہے۔ یہاں پر سالک کی عقل ایک نشتر کی طرح ظاہر پر وار کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ اس مقام پر اکثر سالکین دنیا سے کنارہ کش ہو کر جنگل و بیاباں کا رُخ کرنے لگتے ہیں تاکہ حق کو تلاش کر سکیں۔ سالک اس مقام پر اپنوں و بیگانوں سب سے دور چلا جاتا ہے۔ وہ سب میں ہوتے ہوئے بھی تنہا ہو جاتا ہے۔ سالک کی اس کیفیت کو حضرت پیر سید نصیر الدین نصیر گولڑوی رحمتہ اللہ علیہ نے کچھ بیان فرمایا:

میرا انداز نصیر اہلِ جہاں سے ہے جدا
سب میں شامل ہوں، مگر سب سے الگ بیٹھا ہوں

یہ وہ مقام ہوتا ہے جب سالک دنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے کیونکہ حق کی تڑپ میں وہ ظاہر میں موجود تمام چیزوں کو ایک ایک کر کے توڑ چکا ہوتا ہے۔ یہ سفر سالک کیلئے کربِ مسلسل سے کم نہیں ہوتا۔ اس مقام پر سالک اپنی ننگ و ناموس اور عظمت و توقیر سب کو پسِ پُشت ڈال دیتا ہے اس مقام پر سالک پکھی واس کی طرح در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوتا ہے کیونکہ انکار کے سبب وہ سماج میں معتوب ٹھہرتا ہے۔ سالک کی اس کیفیت کو سلطان العارفین حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ نے کچھ یوں بیان فرمایا:

شالا مسافر کوئی نہ تھیوے ککھ جہاں تھیں بھارے ھُو

تاڑی مار اُڈا نہ باہو اَساں آپیا اُڈن ہارے ھُو

مفہوم یہ ہے کہ خدا کرے کہ کوئی مسافر نہ ہو کہ مسافر سے تو وہ ذرہ بھاری ہوتا ہے جو ایک جگہ پر پڑا رہتا ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ اے طالبِ حق! پکھی واس (باہو) کو در ماندہ نہ کر کہ یہ مسافر جلد ہی اس مقام سے گزر جائے گا۔

ایک سالک کیلئے ظاہر کا یہ سفر بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ لا کا یہ سفر سالک کو صحیح معنوں میں لا سے دوچار کرتا ہے۔ اس مقام پر سالک ہر لحہ ظاہر پر ضربیں لگا رہا ہوتا ہے۔ اپنے آس پاس ظاہر پرستوں کے اعمال اُسے اس مقام پر بالکل معمولی معلوم ہوتے ہیں سالک کی اس کیفیت کو حضرت سائیں بلھے شاہ سے بہتر کون بیان کر سکتا ہے:

جے رب ملدا نہاتیاں دھوتیاں تے رب ملدا مچھیاں ڈڈوواں نوں

جے رب ملدا جنگل بیلے تے رب ملدا گائیاں وچھیاں نوں

مفہوم یہ ہے کہ "اگر خدا نہانے دھونے (وضو طہارت) سے ملتا تو خدا اُن مچھلیوں اور ان جیسے دوسرے آبی جانداروں کو مل گیا ہوتا جو ہر وقت پانی میں رہتے ہیں۔ اسی طرح اگر خدا جنگل یا دشت گھومنے سے ملتا تو خدا چوپائیوں کو مل گیا ہوتا جن کی پوری زندگی جنگل و دشت میں گزر جاتی ہے۔"

سالک کا یہ سفر طویل ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت اذیت ناک بھی ہوتا ہے۔ بعض سالکین

کرام نے تو اس مقام پر انکارِ مطلق کا ایسا پرچار کیا کہ اپنے وقت کے بعض ثقہ ظواہرین کو سالکین کرام پر کفر و الحاد کے فتاوٰی لگانے پڑے۔ حضرت سائیں بلھے شاہ ظواہریت کی مکمل نفی فرماتے ہوئے کچھ یوں رقمطراز ہیں:

پڑھ پڑھ علم شیخ مشائخ کہاویں
اُلٹے مسئلے گھروں بناویں
بے علماں نوں لُٹ لُٹ کھاویں
جھوٹے سچے کریں اقرار

حضرت سائیں بلھے شاہ کہتے ہیں کہ "اے عالمِ دین! تُو نے اتنا علم حاصل کر لیا کہ اب تجھے دنیا شیخ اور اس جیسے کئی معزز القابات سے پُکارتی ہے۔ لوگوں کے اس یقین کو تُو اب اپنے علم کی بنیاد پر خوب استعمال کر رہا ہے اور اپنے مفاد کی خاطر اگر تجھے خود سے مسائل وضع کرنے پڑتے ہیں تو بلا جھجک گھڑ لیتا ہے اور اسی طرح تُو بے علم افراد کی کمائی کھاتا رہتا ہے۔"

ظواہریت کی اسی بنیادی خرابی کو سلطان العارفین حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

حافظ پڑھ پڑھ کرن تکبر ، ملّاں کرن وڈیائی ھُو
ساون مانھ دے بدلاں وانگوں پھرن کتاباں چائی ھُو
جتھے ویکھن چنگا چوکھا پڑھن کلام سوائی ھُو
دوہیں جہانیں مٹھے باہو جہاں کھادی ویچ کمائی ھُو

حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:

"علم حاصل کر کے مولوی بنے پھر اپنے علم پر تکبر کرتے پھر رہے ہیں اور پورے معاشرے میں گرج رہے ہیں ساون کے بادلوں کی طرح، جہاں پر دو پیسے دیکھے وہاں پر شروع ہو گئے گرجنے ،آپ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کا نہ یہ جہان ہے نہ وہ، جنہوں نے اپنے علم کو اپنی روٹی پر قربان

کردیا کیونکہ مولوی اکثر و بیشتر اپنے علم کو اپنی روٹی پر قربان کر دیتے ہیں آپ کی جانب سے بیان کردہ اس افسوس ناک المیہ کا آج ہم اپنے معاشرے میں عام مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

علم اور اہلِ مدرسہ کی اسی بنیادی خرابی کو حکیم الامت علامہ محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ اپنے الفاظ میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا

کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

سالکین کے اسی کُرش اور مبنی برحق رویہ کی بناء پر ظواہرین نے سالکین پر اپنے اپنے وقت میں سلاطینِ اسلامیہ کی وساطت سے کفر و الحاد کے فتاویٰ لگائے لیکن خلقِ خدا کی مسلسل ملامت کے باوجود بھی سالکین کرام نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ایک مقام پر حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "خلق کی ملامت خدا کے دوستوں کی غذاء ہوتی ہے ملامت عاشقوں کیلئے ایک تر و تازہ باغ، دوستوں کیلئے مایہ ناز تفریح، مشاقوں کیلئے راحت اور مریدوں کیلئے سرور ہے۔" اسی طرح معروف صوفی بزرگ حضرت شیخ ابو طاہر حرمی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ہر شخص اپنے اعتقاد کے مطابق جو چاہتا ہے مجھے کہتا ہے مگر یہ سب اسم نہیں القاب ہیں کوئی مجھ کو زندیق (اسلام سے پھرا ہوا) کہے تو اس میں جھگڑا کی کوئی بات نہیں۔"

نفیِ مطلق کے اس مقام کا درد اور برانگیختگی ایک سالک کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا۔ نفی کے اس بے کراں درد کو حضرت خواجہ غلام فرید سائیں رحمتہ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

روندے عمر نبھائی

یار دی خبر نہ کائی

جوبن سارا روپ گوایم

درداں مار مُکائی

حضرت خواجہ غلام فرید فرماتے ہیں کہ "تلاشِ حق کے اس سفر میں روتے ہوئے عمر گزر رہی ہے

لیکن حق کا کوئی سراغ نہ مل سکا حالانکہ اس سفر میں ہم اپنا سب کچھ لٹا کر خالی ہاتھ ہو گئے لیکن درد کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔"

آپ رحمتہ اللہ علیہ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

کی حال سناواں دل دا
کوئی محرم راز نہ ملدا
منہ دھوڑ مٹی سر پایم
سارا ننگ ناموس ونجایم
کوئی پچھن حال نہ آیم
ہتھوں اُلٹا عالم کھلدا

حضرت خواجہ غلام فرید فرماتے ہیں کس سے اپنے اس دردناک سفر کا قصہ بیان کروں کہ آس پاس کوئی اس قابل نظر نہیں آرہا، میں اس سفر میں اپنا سب کچھ قربان کر بیٹھا ہوں حتیٰ کہ اپنی عزت و ناموس سب کچھ گوا بیٹھا ہوں اب بالکل خالی ہاتھ رہ گیا ہوں۔ لوگوں کو چاہئے تھا کہ میری دادرسی کرتے لیکن یہ تو اس کے برعکس مجھے لعن طعن کرتے ہیں اور میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔"

سالک کیلئے تلاشِ حق کی یہ پہلی منزل ہی سرزنش بن جاتی ہے شاید اسی کرب کو محترمہ نوشی گیلانی بیان کر رہی ہیں:

وصال رُت کی یہ پہلی دستک ہی سرزنش ہے
کہ ہجر کے موسم نے رستے رستے سفر کا آغاز کر دیا ہے

تلاشِ حق یعنی کہ نفی مطلق کے اس مقام کو اکثر صوفی شعراء نے بڑے سلیقے اور کمال اسلوب منظوم فرمایا چنانچہ اس کرب آمیز کیفیت کو حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

کوک دلہ متاں رب سنڑے
چا درد ونڈادیاں آہیں ھُو

سینہ تاں میرا درد بھریا

اندر بھڑکن باہیں ہُو

آپ فرماتے ہیں: ''اے میرے دل! فریاد کر ہو سکتا ہے کہ تیری آہ خدا تک پہنچ جائے اور وہاں سے کوئی دادرسی ہو، کیونکہ اب تو میرا سینہ درد سے اُبل رہا ہے اور پسلیوں کے بیچ جستجو کی آگ کے الاؤ جل رہے ہیں۔''

سالکین کے اس دردناک سفر پر ظاہریت کی جانب سے اکثر عتاب نازل ہوتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ زبدۃ العارفین حضرت سیدی حسین ابن منصور الحلاج سے لے کر حضرت سائیں بلھے شاہ صاحب تک صوفیائے کرام رحمہ اللہ علیہم ظواہریت کے ہاتھوں مسلسل جور وستم کے سبب اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے، علم کی متضاد اور مروجہ کسوٹی اُصولِ ضد ہے جسے انگریزی اصطلاح میں (Antilogy) کہا جاتا ہے۔ انسان نے آج تک جتنا بھی علم حاصل کیا اُسکی بنیاد یہی اُصولِ ضد ہے چنانچہ جب تک آپ اندھیرا کا مشاہدہ نہیں کر لیتے روشنی کی پہچان آپ نہیں کر سکتے گویا روشنی کی اہمیت اندھیرے کے ساتھ معلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلمہ طیبہ کا پہلا جز لا ہے اور لا کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسان محض زبان سے لا کا اقرار کر کے لا کا حق ادا کر لے جب تک انسان خود چل کر لا کا سفر اختیار نہیں کر لیتا اُسے الا اللہ میں وہ سکون نصیب نہیں ہو سکتا جو ایک سالک کو بعد میں نصیب ہوتا ہے اس مقام کو ایک صوفی شاعر کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

کافر نہ شُدی لذتِ ایماں کہ شناسی؟

شاعر کہتا ہے کہ ''اے مومن! جب تک تُو کفر کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو جاتا ایمان کی لذت سے محروم ہی رہے گا۔''

سفرِ لا کے بیان میں معروف ہندوستانی صوفی بزرگ حضرت سعید سرمد رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آپ اکثر و بیشتر کلمہ کا پہلا جز پڑھا کرتے آگے نہیں پڑھتے تھے۔ یعنی لا الہ پر رُک جاتے چنانچہ جب شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کی دربار میں حضرت سرمد کو جبہ پوشانِ شرع کے

سامنے لایا گیا تو اُنہوں نے اعتراض کیا کہ سرمد کلمہ مکمل نہیں پڑھتا، بادشاہ نے حکم دیا کہ سرمد کلمہ پڑھو، سرمد حسبِ معمول لا الہ پڑھ کے خاموش ہو گیا۔ جب علماء نے سرمد سے کہا کہ رُک کیوں گئے آگے بھی پڑھو تو آپ نے فرمایا کہ ابھی تک تو میں نفی میں مستغرق ہوں مرتبہ اثبات تک نہیں پہنچا اگر میں الا اللہ کہوں تو یہ جھوٹ ہوگا اور جو دل میں نہ ہو وہ زبان سے کیسے ادا ہو۔"

یہ سچ ہے کہ ایمان علم سے نہیں آتا۔ ایمان حاصل کرنے کیلئے انسان کو ایمان کے راستے پر چلنا پڑتا ہے۔ بلاشبہ یقین اور ایمان ایک لازوال دولت ہے مگر اس کا حصول آسان نہیں زبان سے کہہ دینا کہ میں صاحبِ ایمان ہوں کافی نہیں جب تک کہ اندر سے آواز نہ آئے اور اندر سے آواز صرف اُس وقت آ سکتی ہے جب ایک انسان حق کا مسافر بنتا ہے۔ زبانی کلمہ پڑھ کر بے فکر ہو نے جانے کی کیفیت کو حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

زبانی کلمہ ہر کوئی پڑھدا دل پڑھدا کوئی ھُو

دل دا کلمہ عاشق پڑھدے کی جانڑن یار گلوئی ھُو

آپ فرماتے ہیں کہ "منہ سے ایمان کی گواہی تو ہر کوئی دیتا ہے لیکن دل سے گواہی صرف دل والے ہی دے سکتے ہیں اور یہ بات کلمہ کا رٹہ لگانے والے نہیں سمجھ سکتے۔"

حضرات صوفیائے کرام مطلق علم کے قائل نہیں تھے کیونکہ علم انسان سے اخلاص چھین لیتا ہے صوفیائے کرام کے نزدیک ایمان کی اصل عشق ہے۔ ایمان تو ایک وسیلہ ہے مقامِ عشق تک پہنچنے کا، جبکہ علم کی اصل انکار، علم ہی انسان کو ایمان و عشق سے دور کر دیتا ہے کیونکہ منطق شک اور انکار کے درمیان واقع ہے اسی اہم نکتہ کو حضرت سائیں بلھے شاہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

پڑھ پڑھ نفل نماز گزاریں

اُچیاں بانگاں چانگاں ماریں

منبر تے چڑھ وعظ پکاریں

کیتا تینوں علم خوار

آپ فرماتے ہیں کہ "اے صاحب علم تُو دن رات خالی دل سے اُونچی اُونچی آواز سے اذانیں دے رہا ہوتا ہے اور دھڑا دھڑ نمازیں پڑھ رہا ہوتا ہے اسکے علاوہ اپنے علم کا رعب جمانے کیلئے منبر پر چڑھ کے لوگوں پر اپنی دھاک بٹھاتا ہے پس اسی ہلچل میں تُو اپنی عمر ضائع کر دیتا ہے۔"

سالکین کرام جانتے ہیں کہ ایمان کیلئے علم کی ضرورت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ایمان کیلئے حق کا سفر طے کرنا پڑتا ہے جب تک ایک انسان کا ظاہر و باطن ایک نہیں ہو جاتا تب تک اُسے کوئی علم فائدہ نہیں دے سکتا۔ مطلق علم کی اسی قباحت کو حضرت سلطان باہو سائیں رحمتہ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

جے کر دین علم وچ ہوندا تاں سر نیزے کیوں چڑھدے ہُو
اٹھارہ ہزار جو عالم آہا اگے حسین دے مردے ہُو

حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں کہ "اگر دین وایمان علم میں ہوتا تو میدانِ کربلا میں مسلمانوں نے اپنے ہی رسول ﷺ کے نواسہ اور اُنکے رفقاء کے سر کیوں قلم کر دیئے تھے حالانکہ وہ ہم سے بہتر علمِ دین رکھتے تھے پس دین یا ایمان کا تعلق علم سے نہیں جذبہ سے ہے۔"

صوفیائے کرام رحمہ اللہ علیہم کا دین دراصل اصل دین ہے۔ ایمان کا صحیح حق جماعتِ صوفیائے کرام رحمہ اللہ علیہم نے ادا کیا۔ ظواہرین پر تنقید کی ضرورت نہیں کہ وہ بھی انبیائے کرام علیہم السلام کے وارثین شمار کیے جاتے ہیں لیکن ایمان کی کماحقہ لذت ایک صوفی سے بڑھ کے کوئی نہیں جان سکتا کیونکہ اصل مومن صوفی ہی ہوتا ہے۔

معزز قارئین! میری کیا مجال جو تلاشِ حق کے سفر کو کماحقہ بیان کر سکوں۔ میں نے تو تلاشِ حق کی پہلی منزل لا کو مختصر الفاظ میں بیان کرنے کی جسارت کی ہے۔ تلاشِ حق کے اس مقام کا صحیح معنوں میں ادراک صرف ایک سالک ہی کر سکتا ہے۔ کوئی غیر سالک اس مقام کے راز و نیاز سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ عشق تک پہنچنے کیلئے سب سے پہلا قدم لا ہے کہ جب تک آپ ہر چیز سے بے نیاز نہیں ہو جاتے اپنے محبوب کی جانب نہیں آسکتے کہ عشق جس کو اپناتا ہے اُسے پھر کسی دوسرے یا

تیسرے کا نہیں چھوڑتا۔ یہی اصل توحید ہے اور ہر صوفی صحیح معنوں میں موحد ہوتا ہے۔ عشق انسان کو شرک کی تمام تر آلائشوں سے پاک کر لیتا ہے اور پھر عاشق کے وجود کا ذرہ ذرہ محبوب کی توحید میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس کا مفصل تذکرہ ہم عشق کے باب میں کریں سر دست ہم لا سے الا اللہ کی جانب کوچ کر رہے ہیں۔

عرفان

عرفان کہتے ہیں پہچان کو، حق کی پہچان کہ حق کیا ہے؟ چنانچہ جب ایک سالک ظاہر کی مکمل نفی کرلیتا ہے تو انتہائی کرب وملال کی صورت میں اب اپنے باطن کا رُخ کرتا ہے کہ ظاہر میں اُسے کچھ نہیں ملا، باطن میں سب سے پہلے اسے اپنے ہونے کا جواز درکار ہوتا ہے چنانچہ پھر سالک اپنے ہونے کا جواز اپنے باطن سے پوچھنے لگتا ہے کیونکہ ظاہر کی نفی کے بعد یہ دوبارہ ظاہر کا رُخ نہیں کر پاتا۔ یہاں پر سالک ایک نئے درد سے آشنا ہوتا ہے اور وہ درد دراصل اسکے ہونے کے جواز کی عدم دستیابی ہے۔ یہ مقام ایک سالک پر کسی عذابِ مسلسل سے کم نہیں ہوتا۔ سالک کے اسی اذیت ناک مقام کو معروف صوفی شاعر مرزا اسداللہ خان غالب نے کچھ یوں بیان فرمایا:

ڈبویا مجھ کو ہونے نے

نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

ایک سالک اس مقام پر اپنے وجود کو لایعنی تصور کرتا ہے اور سوائے لاادریت کے کچھ بھی اسکے ہاتھ نہیں لگتا۔ سالک کے اسی مقام کو حضرت سائیں بلھے شاہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں۔

نہ میں مومن وچ مسیتاں

نہ میں وچ کفر دیاں ریتاں

نہ میں پاکاں وچ پلیتاں

نہ میں موسیٰ نہ فرعون

بلھا کی جانا میں کون

آپ فرماتے ہیں کہ "میں مسجد کے چکر لگانے والا مومن ہوں اور نہ ہی کفر کی ضلالت میں گرا ہوا کافر ہوں، میں پاک ہوں نہ ہی غلاظت سے لتھڑا ہوا، میں موسیٰ ہوں نہ ہی فرعون، پس اے بلھے شاہ! میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔"

ظاہر کی نفی کے بعد ایک سالک کیلئے یہ مقام ایک مسلسل عذاب کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اپنے ہونے کا مطلق جواز نہ پا کر وہ نہ صرف سیخ پا ہو جاتا ہے بلکہ روحانی و اعصابی طور پر پوری طرح مضمحل بھی ہو جاتا ہے۔ ایک سالک جب ظاہر کا تجزیہ کر کے نفی کرنے کے بعد باطن کا تجزیہ کرتا ہے تو وہ بے سُدھ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اپنا سفر تک چھوڑنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کو ہمارے دور کے ایک معروف صوفی شاعر حضرت واصف علی واصف رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ یوں بیان فرمایا:

واصف یہ کس مقام پہ لایا مجھے جنوں
اب اُنکی جستجو ہے نہ اپنی تلاش ہے

لیکن اُصول یہ ہے کہ چلنے والے کبھی رُکتے نہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ چلنے والوں کو آخر کار منزل مل ہی جاتی ہے۔ مقامِ لاادریت کے بعد ایک سالک مقام حیرت کی طرف چل پڑتا ہے۔ ایک سالک اس مقام پر مارے حیرت کے زندہ لاش بن جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ کہاں گئی وہ تجزیاتی قوت جو ظاہر میں اشیاء کو ایک ایک کر کے توڑتی گئی۔ اب باطن پر آ کر کیوں رُک گئی ہے۔ اِسی قوت کا رُکنا دراصل حیرت کہلاتا ہے۔ اسی کیفیت کو ایک صوفی شاعر کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

کھلی جب کہ چشمِ دلِ حزیں
تو وہ نم رہا نہ تری رہی
ہوئی حیرت ایسی کچھ آنکھ پر
کہ اثر کی بے اثری رہی

پڑی گوشِ جاں میں عجب ندا
کہ جگر نہ بے جگری رہی
خبر تحیر عشق سُن
نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا
جو رہی سو بے خبری رہی

ایک سالک کیلئے یہ مقام اذیت تو ختم کر دیتا ہے لیکن ساتھ ہی جستجو بھی ماند کر دیتا ہے۔ گویا ایک سالک مقامِ حیرت پر اپنے تمام ہتھیار ڈال دیتا ہے حتیٰ کہ خود جستجو کو بھی ترک کر دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ سالک کے اس مقام کو ایک اور صوفی شاعر نے کچھ یوں بیان فرمایا:

نہ مقامِ گفتگو ہے نہ محلِ جستجو ہے
نہ وہاں حواس پہنچیں نہ خرد کو ہے رسائی

لیکن جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ چلنے والے کبھی رُکتے نہیں۔ سالک اس مقام پر کچھ دیر کیلئے ستا کر آگے نکل جاتا ہے۔ مقامِ حیرت دراصل عرفان ہے۔ مقامِ حیرت پر سالک تجریاتی قوت کی رسائی سے مکمل آگاہ ہو کر اپنے وجود پر ہی اکتفا کر لیتا ہے کیونکہ آگے پھر روح اُس کا ساتھ نہیں دے پاتی چنانچہ اسی مقام پر لا کا سفر بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ادراکِ حق

سفرِ لا میں مسلسل اذیت وملامت کے بعد سالک باطن کا رُخ کرتا ہے جہاں پر وہ اپنی حدود سے آگاہی حاصل کرلیتا ہے، انہی حدود کی آگاہی تصوف کی اصطلاح میں عرفان کہلاتی ہے۔ عرفان یعنی شناخت اپنی حدود کی، اس مقام کے بعد سالک اپنے وجود پرایمان لے آتا ہے۔ ظاہر وباطن کی پے در پے بے یقینی کے بعد سالک کو یہ مقام راحت سے بھرپور محسوس ہوتا ہے۔ اب مسلسل نفی کے بعد سالک اثبات پر قائم ہوجاتا ہے اور یہی دراصل الا اللہ ہے۔ یہی حق ہے اور یہی اصل ولایت ہے۔ سالک وجود پر نہ صرف اکتفا کرلیتا ہے بلکہ جان لیتا ہے کہ یہی حق ہے۔ اس مقام پر سالک تسکین محسوس کرتا ہے کیونکہ اب وہ بے یقینی سے یقینِ کامل کی جانب پلٹ چکا ہوتا ہے۔ سالک کی روح اس مقام پر شاداب ہوجاتی ہے۔ سالک کی اس کیفیت کو سلطان العارفین حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

الف اللہ چنبے دی بوٹی من وچ مرشد لائی ھُو
نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جائی ھُو
اندر بوٹی مشک مچایا جان پھلن تے آئی ھُو
جیوے مرشد کامل باہو جیں اے بوٹی لائی۔ ھُو

حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں کہ ”میرے مرشد یعنی میری روحانی طاقت نے میرے اندر ایمان کا تخم ڈالا جو بتدریج نفی کے بعد اثبات کے پانی سے سیراب ہوا، اب یہ تخم ایک سرسبز پودے

کی شکل اختیار کر چکا ہے، پس آفریں ہو میری روح پر جو مجھے یہاں تک لے آئی۔"

جیوے مُرشد کامل باہو سے مُراد سائیں کی دراصل اپنی روح کی جانب ہے جو مسلسل سفر کر کے یہاں تک پہنچی۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں پر علم و تحقیق بے وقعت ہو جاتی ہے۔ ادراکِ حق کے بعد نہ تو علم کی کوئی اہمیت باقی رہتی ہے نہ ہی جستجو کی، اس مقام کی کیفیت کو حضرت سائیں بلھے شاہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

علموں بس کریں او یار

ہکو الف تینوں درکار

مفہوم اس کا یہ ہے کہ "اے سالک بس کر دے اب علم و جستجو کے اس اذیت ناک سفر کو، پس ایمانِ مطلق پر اکتفا کر لے۔"

سائیں بلھے شاہ کا الف اور سائیں سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کا الف دراصل حق پر یقینِ کامل ہے۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جب سالک کا ظاہر و باطن ایک ہو جاتا ہے۔ یعنی اس مقام پر سالک کے ظاہر و باطن میں کوئی تفریق نہیں رہتی۔ اس کیفیت کو حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

اندر ہُو تے باہر ہُو وت ہُو کی لبیندا ہُو

آپ فرماتے ہیں کہ "جب ظاہر و باطن ایک ہو گیا تو اب کس چیز کی تلاش باقی رہ گئی ہے یعنی تلاش اب تمام ہوئی۔"

اسی کیفیت کو ایک اور صوفی شاعر کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

ھر ھر میں ھے ھر بسے ھر ھر کو ھر کی آس

ھر کو ھر ھر ڈھونڈ پھری اور ھر ھے مورے پاس

شاعر فرماتے ہیں کہ "حق تو باطن میں ہی ہے اور میں اسے اپنی لاعلمی کی وجہ سے باہر تلاش کر رہا تھا حالانکہ یہ تو میرے اندر پہلے ہی سے موجود ہے۔"

سالک جب جان لیتا ہے کہ اُس کا وجود ہی حق الیقین ہے اور اُس کا ہونا ہی اصل الاصول ہے تو سالک یہاں تک پہنچ کر حق کا کما حقہ ادراک بھی کر چکا ہوتا ہے یعنی یہ وہ مقام ہے جہاں پر ایک سالک کو ظاہر و باطن میں کوئی تفریق نظر نہیں آتی۔ اس مقام پر وہ دوئی (تفریق ظاہر و باطن) کو پوری طرح سمجھ چکا ہوتا ہے اور یہ بھی جان چکا ہوتا ہے کہ دوئی فریب محض ہے دوئی کی حقیقت جاننے کے بعد سالک سراپا حق بن جاتا ہے اس مقام پر سالک کے کردار اور گفتار سے حق نچوتے بادلوں سے بارش کے قطروں کی مانند برسنے لگتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں پر سالک کی گفت وحی و الہام کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

وجدان

وجدان دراصل ادراکِ حق کے بعد شروع ہوتا ہے یہ ایک ایسا اُلوہی کارخانہ ہے جہاں سے سالک زبانِ خلق نقارہ خدا کے مصداق قیام کرتا ہے۔ گویا اس مقام پر ایک سالک کی تحریر و بیان دراصل حق کی زبان ہوتی ہے، اسی کیفیت کو حدیثِ قدسی میں کچھ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ''بندہ جب مسلسل ریاضت کے سبب حق تک رسائی حاصل کرلیتا ہے تو پھر وہ حق تعالیٰ کا ہاتھ، کان، آنکھ اور زبان بن جاتا ہے۔ گویا سالک کا دیکھنا سننا اور بولنا دراصل حق تعالیٰ کا دیکھنا سننا اور بولنا بن جاتا ہے۔''

اس کیفیت میں اکثر و بیشتر سالک غلبہ حال میں رہتا ہے، چنانچہ اُس کے منہ سے نکلنے والا ہر حرف حق کا پرتو بن جاتا ہے۔ اس مقام پر سالک پر ہمہ وقت الہام جاری و ساری رہتا ہے۔ الہام والقاء کی اسی کیفیت کو صوفیائے کرام نے اصطلاح علمِ لدنّی سے تعبیر کیا۔ گویا اس مقام پر سالک کو وہ علم عطاء کردیا جاتا ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کو دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جد العارفین حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''عارف ٹھیک وہاں سے لیتا ہے جہاں سے انبیائے کرام علیہم السلام لیتے ہیں۔''

واضح رہے کہ نبوتِ تشریعی کا اختتام ہو چکا، نبوتِ سلوک جاری و ساری ہے۔ نبوتِ تشریعی کے متعلق محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہی ایک مسلمان کیلئے کافی و شافی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''انا خاتم النبیین لانبی بعدی''

''میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔''

چنانچہ شریعت کی بنیاد پر نبوت کا دعوٰی اور اقرار ایک مسلمان کیلئے یکسر باطل ہے کیونکہ قرآن نے شریعتِ اُلوہی کا سلسلہ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر مسدود کردیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا''

''آج ہم نے آپ کیلئے آپ کا دین (قوانینِ الٰہیہ) مکمل کردیا اور آپ پر اپنی نعمت پوری کردی اور اسلام کو ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے آپ کیلئے پسند کرلیا)۔''

قرآن کریم کے اس واضح اور دوٹوک اعلان کے بعد کسی نئی شریعت یا ضابطہ کی قطعی گنجائش باقی نہ رہی لیکن نبوتِ سلوک جاری وساری رہے گی اور رہنا بھی چاہئے کہ کائنات کے نظم کو جمود نہیں، انسان اور سماج کی بدلتی اقدار ہر لحہ جدت وحدث کی جانب رواں دواں ہیں، غالباً اسی اہم سرِ کائنات کا تذکرہ حضرت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اپنی ایک نظم ستارہ میں کیا ہے:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

چنانچہ ہر دور میں انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ صوفیائے کرام بھی انسانیت کی رہنمائی کیلئے اپنے آپ کو وقف کرتے رہے۔ بہت مناسب ہوگا جو ہم چند قابلِ ذکر صوفیائے کرام کا تذکرہ کرلیں جو اصحابِ وجدان میں سے تھے۔ اُستادالاولیاء حضرت خواجہ حسن بصری، سیدالطائفہ حضرت جنید بغدادی، جدالعارفین حضرت شیخِ اکبر سیدی محی الدین ابن عربی، حضرت شیخ غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی، حجت الاسلام حضرت ابو حامد امام غزالی اور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ علیہم کے علاوہ متعدد اصحابِ وجدان نے مسلسل اور پوری دیانتداری سے انسانیت تک الہامِ ربانی پہنچایا۔ وجدان دراصل حق کی زبان حق کی تحریر اور حق کے نقوش ہیں۔ یہ

ایک ایسا ذریعہ علم ہے جہاں پر حواس کی پہنچ نہیں، جہاں پر احساس کی بجائے اوراد وقوع پذیر ہوتے ہے۔ یہ ایک ایسی صدائے بلند ہے جس کے اسرار و رموز سے خود سالک کی روح بھی ناشناش ہوتی ہے کیونکہ وجدان وارد ہوتا ہے اوراوراد سے قبل سالک لاعلم رہتا ہے۔ وہ نہیں جانتا اُس پر آنے والے وقت میں کیا کچھ وارد ہوگا، مگر جو بھی وارد ہوتا ہے ظلمت کے تمام پردوں کو چاک کر کے سورج کی کرنوں کی طرح نمودار ہوتا ہے۔ وجدان کی کماحقہ تعریف تو خود صاحب وجدان بھی بیان نہیں کر سکتا، ہم نے تو سالکین کی محض علمی رہنمائی کر دی۔

کشف الاسرار

وجدان کے بعد ایک سالک کی اگلی منزل انکشافاتِ اسرار کی ہوتی ہے۔ گویا اس مقام پر ایک سالک کے سامنے کائنات و مابعد الکائنات کے سربستہ راز عیاں ہونے لگتے ہیں۔ الہاماتِ ربانیہ کے بعد ایک سالک اس مقام پر نادر مشاہدات و تجربات سے دوچار ہوتا ہے۔ اس مقام پر سالک کا ہر مشاہدہ دراصل حق کا مشاہدہ ہوتا ہے اور سالک کا ہر تجربہ علومِ ربانیہ میں شمار ہوتا ہے۔ کشف کا یہ سلسلہ سالک کو انسان، کائنات اور مابعد الکائنات کے گوناں گوں حقائق سے روشناس کراتا ہے۔ اس مقام پر ایک سالک انسان کی طبعی و مابعد الطبعی حقیقت سے کماحقہ آگاہ ہو جاتا ہے، مشاہدات و تجربات مختلف ہو سکتے ہیں لیکن نتائج مختلف نہیں ہو سکتے۔ البتہ مشاہدات و تجربات میں مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ جدت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ دورِ حاضر میں سالکین کے مشاہدات و تجربات اپنے اندر ایک لطیف جدت لئے مختلف ضرور ہو سکتے ہیں لیکن نتائج کے اعتبار سے اختلاف ممکن نہیں کیونکہ کائنات سمیت انسان ایک مخصوص دائرے میں تیر رہا ہے۔

"کل فی فلک یسبحون"

"اور تمام کرّے اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔"

اس دائرہ کے عواقب و مناظر تو بہرحال مطلق ہیں لیکن سالکین کے انکشافات مختلف ضرور ہو سکتے ہیں۔ اس ضمن میں اصحابِ کشف کی نگارشات ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ ہم یہاں پر چند قابلِ ذکر اصحابِ کشف کے نام اُن کی نگارشات سمیت پیش کرتے ہیں تاکہ سالکین کرام کو اس اہم

مقام کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

جد العارفین حضرت شیخ اکبر ابن العربی کی فصوص الحکم و فتوحات مکیہ، حضرت امام عبدالکریم بن ہوازن قشیری المعروف امام قشیری کی الرسالہ قشیریہ، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی فتوح الغیب، حضرت امام ابوحامد غزالی کی مکاشفتہ القلوب، حضرت شیخ ابوطالب مکی کی قوت القلوب اور حضرت شیخ علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کی کشف المحجوب سالکین کیلئے معاون کتب ہیں جن سے مقامِ کشف کو سمجھنے میں بہت مدد لی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ہر سالک مقامِ کشف میں مختلف انواع کے انکشافات سے روُ بہ شناس ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ انکشافات طبعی بھی ہو سکتے ہیں اور مابعد الطبعی بھی، طبعی سے مراد وجود اور کائنات جبکہ مابعد الطبعی سے مُراد دائرہ علم و ماحولہ کے متعلق، وقوعِ کشف کی نوعیت ہمیشہ سے گونا گوں رہی ہے ہر سالک ادرکِ حق کے بعد مختلف قسم کے تجربات و مشاہدات سے گزرتا ہے اور ہر سالک پر اپنے ہی ڈھنگ سے اسرار عیاں ہوتے ہیں۔ وجود اور کائنات سے وابستہ اسرار کا مخزن صرف ایک جید سالک ہی کے قبضہ میں آتا ہے، بغیر جہدِ مسلسل اور ریاضت کے اس مقام تک پہنچنا ممکن نہیں، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ مقامِ کشف الاسرار تک پہنچنے کیلئے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور اُن تمام مراحل سے گزرنے کے بعد کہیں جا کے سالک اس قابل ہوتا ہے کہ اُس پر کائنات و حیات کے سربستہ راز افشاء کئے جائیں۔ مقامِ کشف الاسرار میں سب سے اہم مقام دراصل اپنی ذات سے وابستہ اسرار کا عیاں ہونا ہے۔ گویا انسانی ذات میں چھپے لعل و گہر کشف الاسرار کی ہی بدولت عیاں ہوتے ہیں۔

قیامِ من

چونکہ سالک ایک پکھی واس کی مانند ہوتا ہے اس لئے اس کا کسی ایک مقام پر مستقل رُک جانا ممکن نہیں ہوتا، چنانچہ مقامِ کشف کے بعد ایک سالک جس مقام پر پہنچتا ہے اُسے مجذوب نے ''قیامِ من'' سے تعبیر کیا۔ یہی وہ مقام ہے جس کو ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ''خودی'' سے تعبیر کیا اور اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں:

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں

یہی توحید تھی جس کو نہ تُو سمجھا نہ میں سمجھا

یہ وہ مقام ہے جہاں پر ایک سالک پوری طرح اپنی ذات کا ادراک حاصل کر لیتا ہے اور وہ یہ جان لیتا ہے صرف وہ ہی موردِ حق ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے جرمنی کے معروف فلاسفر فریڈرک نطشے نے سپر مین (Superman) اور فعلیات (Psychology) کے ماہر سگمنڈ فرائڈ نے سپر ایگو(Super ego) سے تعبیر کیا۔ اِسی مقام کے اسرار و رموز فارسی کے ایک شاعر نے صرف ایک مصرع میں پرو دیئے۔ فرماتے ہیں:

خود را نہ پرستیدہ ای عرفاں کے شناسی؟

یعنی ''جب تک اپنی ذات کا ادراک حاصل نہیں کیا تب تک کسی بھی چیز کا ادراک ممکن نہیں۔''
فلسفی ہو سائنس دان یا ماہرِ فعلیات تمام علماء تلاشِ حق کے مسافر ہوتے ہیں۔ فلسفی نطق میں حق تلاش کرتا ہے تو سائنسدان لیباٹری میں، جبکہ ماہرِ فعلیات انسانی سلوک میں، گویا ہر مسافر اپنی اپنی

سمت میں حق کا متلاشی ہوتا ہے۔ ہمارے قدیم صوفیانہ مزاج میں فلسفی اور سائنسدان کو گمراہ سمجھا جاتا ہے جو کہ سراز سر مبنی بر تعصب اور غیر متوازن رویہ ہے۔ خود کو حق کا مسافر اور مقابل کو گمراہ سمجھنا قطعاً انصاف نہیں، صوفی تو وحدت کا قائل ہوتا ہے اور وحدت کا قائل تو کبھی بھی اور کسی بھی صورت میں کسی انسان کو گمراہ نہیں سمجھتا کیونکہ ایسا کرنے سے فکرِ وحدت پر حرف آتا ہے۔ منصف جانبداری اختیار کر لے تو انصاف پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے منصف کو ہمیشہ اعتدال کی راہ اپنانی چاہئے اور اعتدال کی بات یہ ہے کہ روئے زمین پر موجود تمام راہِ حق کے مسافر اپنے اپنے فکر و عمل میں مخلص اور مبنی بر حق ہیں۔ پس یہی وحدت کا صحیح مفہوم ہے، کسبِ مسلسل اور ریاضت کے ذریعے کوئی بھی انسان حق تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اس میں کسی گروہ یا جماعت کو تخصیص یا فوقیت حاصل نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"ان اکرمکم عند الله اتقاکم" "اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا معیار تقوٰی ہے۔"

تقوٰی کا تعلق نیت سے ہے اور نیت کا حال صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس لئے انسان کو کسی پر تنقید کرتے ہوئے احتیاط کرنی چاہئے کیونکہ جو چیز دیکھنے میں نظر آتی ہے اپنے اصل کے اعتبار سے وہ ویسی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کو پرکھنے سے پہلے اپنی ذات کی معرفت ضروری ہے تاکہ کسی پر اُنگلی اُٹھانے کی حاجت باقی نہ رہے، قیامِ من پر ایک سالک اپنی ذات کے ماحول سے پوری طرح آشنا ہو جاتا ہے اور یہیں سے اِسے اصل دولت نصیب ہوتی ہے۔
ڈاکٹر علامہ محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ اسی نکتہ کی مزید وضاحت کچھ یوں فرماتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

قیامِ من کو ہم شعوری انا سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، اس مقام پر سالک اپنی ذات کی معرفت تو حاصل کر لیتا ہے لیکن حسبِ سابق سالک شعوری انا کے ادراک کے بعد اس پر قیام کو اذیت ناک جان کر اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا ہے، چنانچہ قیامِ من سے نکل کر سالک کے سامنے جو مقام کھڑا ہوتا ہے، وہ مقامِ تُو یا عشقِ وجودیہ کہلاتا ہے۔ گویا اس مقام کی انتہاء پر حق اپنے اصل کی جانب لوٹنے کو بے قرار ہوتا ہے۔

عشقِ وجودیہ

عشقِ وجودیہ یعنی جسے عام اور قدیم صوفیانہ اصطلاح میں عشقِ مجازی بھی کہا جاتا ہے۔ میں نے عشقِ مجازی کو عشقِ وجودیہ سے اس لئے تعبیر کیا کہ عموماً اصطلاح عشقِ مجازی علمی و مذہبی حلقوں میں سوءِ نظر کی شکار ہو گئی ہے، جبکہ لطف کی پہلی منزل یہی ہے عشق کی اس پہلی اور نہایت اہم منزل کو سوءِ نظر سے بچانے کی خاطر اس کو ایک جدید اور وسیع اصطلاح سے تعبیر کرنا پڑا، چنانچہ اصل کی منزلِ اول دراصل عشقِ وجودیہ ہی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے سالک اپنے اصل کی جانب دیوانہ وار آگے بڑھتا ہے۔ سالک جان لیتا ہے کہ حق اُس میں حلول کر چکا اور اُس کے موردِ حق ہونے میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش موجود نہیں۔ اس ادراک کے بعد شعوری انا تکلیف دہ اور لاحاصل سانسوں کا ریوڑ بن جاتی ہے جس کو محض وقت کی لاٹھی ہانک رہی ہوتی ہے۔ سالک پر شعوری انا سے بڑھ کے کوئی عذاب نہیں۔ اس لئے قیامِ من سے نکلنے کیلئے اُسے تُو کا سہارا لینا پڑتا ہے جن حسی ذرائع کی بنیادی پر سالک شعوری انا تک پہنچتا ہے اُنہی سے پیچھا چھڑانے کے لئے سالک اب سلوک سے عشق کی جانب کوچ کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر سالک کی نگاہ شوخ ہو جاتی ہے اور وہ اپنا رنگ بھول کر مخاطب کے رنگ میں رنگنے کے درپے ہوتا ہے۔ گویا سالک اب دلبری کی دہلیز پر قدم رکھ چکا ہوتا ہے۔ اسی مقام کو حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

وجود سے وجود تک کا اتصال دراصل نگاہ سے شروع ہوتا ہے، عشق کی ابتداء ہوا چاہتی ہے، نظروں نے اپنا مقام ڈھونڈ لیا، نظر کے معاملہ میں سیدی و مرشدی حضرت رومیؒ تو اس نہج پر مقیم تھے کہ آپ نے فرمایا:

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

حضرت رومیؒ فرماتے ہیں کہ "انسان محض نظری وجود رکھتا ہے اور نظری وجود یہ ہے کہ انسان پر کسی کی نظر پڑ جائے (معشوق) یا پھر خود کسی کو اپنی نگاہ میں لپیٹ لے (عاشق)، اسکے علاوہ انسان محض خون کا ایک لوتھڑا ہے"۔

اب سانسوں نے اپنا جواز تلاش کر لیا، وقت انمول ہوا اور پُر لطف احساس کی بینی بینی خوشبو سالک کو اپنے محبوب کے خدوخال میں مفقود کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں سالک سلوک کی تمام ترعنائیاں و کلفتیں بھول کر اپنے محبوب کے خواب و خیال میں سراپا مسکور ہو جاتا ہے۔ لطف کی میٹھی کٹاری سالک کو آہستہ آہستہ ایک نئے درد سے آشنا کرتی جا رہی ہوتی ہے۔ اس خوبصورت امتزاج کو حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

سکھی کاسے کہوں موہے لاج لگے
موہے پی کی نجریا مار گئی
میں نے لاج کا گھونگٹ کھول دیا
پیا جیت گئے میں ہار گئی

امیر خسرو فرماتے ہیں کہ "اے دوست تجھے کیا بتاؤں جب سے محبوب کو دیکھا اُس کی نظر کے جادو نے مجھے مضمحل کر دیا اور میں اب اُسے دوبارہ دیکھنے کیلئے مسلسل تڑپ رہا ہوں، چنانچہ میں اب اپنی ذات سے ماوراء ہو کر اپنے محبوب کے آگے سر بسجود ہو چکا، گویا میں شعوری انا کو ہرا کر محبوب کی ذات میں مدغم ہو چکا ہوں۔"

عشقِ وجودیہ دراصل سالک کیلئے امرتِ لذیدہ ومقامِ سکینہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ وجود سے مجذوب کی مُراد دراصل وجودِ مطلق ہے۔ سالک کی نظر کا کمال جب طبع کا احاطہ کرتا ہے تو یہ کمال ایک لازوال جذبے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پس اسی کا نام عشقِ وجودیہ ہے، چنانچہ اس کا تعلق انسانی جنس سے لے کر موجودات کی کسی بھی نوع سے ہوسکتا ہے۔ صوفیائے کرام کے ہاں اکثر وبیشتر اس کا تعلق تمرید (تذکیر) اور گاہے گاہے تعویر (تانیث) سے رہا ہے۔ بالخصوص مقامِ عشقِ وجودیہ میں حضرت امیر خسرو نے تو بعض اوقات بڑی بے باکی کا مظاہر کیا ہے۔ ایک مقام پر آپ فرماتے ہیں:

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آری آری می کنم با خلق مارا کار نیست

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ "عوام کہتی ہے کہ خسرو عشقِ وجودیہ کے رسیا اور اکثر وجوذ پر قیام کرتے ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ جی ہاں! جی ہاں میں وجود پر قیام کرتا ہوں اے لوگو اور تمہیں اس معاملہ میں مجھ سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔"

سالک اس مقام پر ایسا محسوس کرتا ہے جیسے اس سے قبل کی تمام منازل گویا مقامِ تُو تک پہنچنے کا ہی وسیلہ تھیں۔ معروف صوفی بزرگ حضرت سعید سرمد اس کیفیت کو کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

سرمد در دیں عجب شکستے کردی
ایماں بہ فدائے چشمِ مستے کردی
عمر کہ بہ آیات و احادیث گزشت
رفتی و نثار بت پرستے کردی

حضرت سعید سرمد نے اس مقام پر اپنے محبوب کے حضور سب کچھ تیاگ دیا، گویا اپنی عمر کی تمام تر عبادت کا ماحصل یہی مقام تھا۔ وہ جو اس سے قبل کی منازل تھیں، وہ بھی دراصل عشقِ وجودیہ پر ہی بلیدان کرنے کیلئے وقوع پذیر ہوئی تھیں۔"

عشقِ وجودیہ دراصل وہ لو ہے جو قمقمہ کی طرح آگے کی تمام تر منازل میں سالک کیلئے روشنی بکھیرتا جارہا ہوتا ہے۔ مقامِ تُو یا عشقِ وجودیہ سالک کیلئے مسحور کُن خنکی کی مانند ہوتا ہے، ہمہ وقت محبوب کے حُسن و جمال میں آنکھیں مُوند کر سالک ایک عجیب و غریب کیف سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کیفیتِ انشراحیت کو حضرت امیر خسرو سے بہتر کون بیان کرسکتا ہے:

شد ہوا سرد کنوں آتش و خرگاہ کجاست

بادہ روشن و رخسارہ دل خواہ کجاست

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ "ہوا میں خنکی آ گئی ہے۔ لہٰذا آتش و خرگاہ کی تلاش ہے، تلاش ہے بادۂ روشن کی، رُخِ محبوب اور اُس کے دمکتے رخسار کی، گویا ہوا کی خنکی نے جو سرور پیدا کر دیا ہے اس سے حُسن اور اسکی لذت کا احساس جاگ اُٹھا ہے۔"

وجود سے وجود تک کا یہ سفر سالک کو عجیب و غریب کیفیات سے دوچار کرتا ہے۔ محبوب کی چاہ میں عاشق بے پناہ راحت سے گزرتا ہے۔ گویا ہمہ وقت وہ اپنے محبوب کے خواب و خیال میں غرق رہتا ہے۔ بیداری اور حالتِ تنویم ہر دو کیفیات میں سالک اپنے محبوب کے حُسن و جمال میں مقید ہو جاتا ہے، عشق کے اس مخملیں کیف کو عہد نامہ قدیم (زبور) کتاب غزل الغزلات باب 5 میں کمال شائستگی اور مہاسندرتا سے بیان کیا گیا ہے:۔

مفہوم اس کا یہ ہے کہ "میں سوتی ہوں اور میرا دل جاگتا ہے میرے محبوب کی آواز ہے جو کھٹکھٹاتا ہے اور کہتا ہے میرے لئے دروازہ کھول میری محبوبہ! میری پیاری! میری کبوتری! میری پاکیزہ! کیونکہ میرا سر شبنم سے تر ہے اور میری زلفیں رات کی بوندوں سے بھری ہیں"۔

چونکہ یہ حصولِ وجود ہی کی تڑپ ہوتی ہے اس لئے اس قیام کا دورانیہ نہایت قلیل ہوتا ہے، کوئی بھی سالک اُس وقت تک روح یا حق تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ مقامِ تُو یعنی عشقِ وجودیہ پر قیام نہیں کر لیتا، مقامِ تُو کی تڑپ میں پہلے پہل تو عجیب سرور اور لذت محسوس ہوتی ہے لیکن جوں جوں یہ تڑپ اظہار کا ذریعہ لیتی جاتی ہے اُتنی ہی اس میں تاثیر کم ہوتی جاتی ہے۔ اتصال مع الوجود

کی یہ حدّت اُس وقت اپنے اختتام کو پہنچتی ہے جب سالک وجود سے براہِ راست اتصال کر لیتا ہے۔ سالک کے اتصال کے ساتھ ہی اس مقام کا انتہ ہو جاتا ہے، عشقِ وجودیہ کی بقاء دراصل تفصیل (فاصلہ) میں مقیم ہے، جب تک وجود سے وجود کے درمیان فصل حائل ہوتی ہے تب تک عشق لذت وسرور کا ضامن ہوتا ہے، جیسے فصال وصال میں تبدیل ہوا، سالک مقامِ تُو سے اپنے اگلے مقام کی طرف نکل پڑا، عشقِ وجودیہ سے انتقال کے دو ہی مطلق ذرائع ہیں۔ ایک وہ جو ہم نے اُوپر بیان کر دیا، یعنی اتصال مع الوجود، دوسرا ذریعہ افتراق بین الوجود ہے۔ افتراق دراصل سالک کو وجود سے مقنوط کر کے مجبورِ جبر پر آمادہ کرتا ہے جس کے بعد سالک روح کی جانب رُخ کرتا ہے۔ اس کے برعکس اتصال انتہائے لطف کے بعد مقامِ تُو سے فطرتی مہجور کا وسیلہ ہے۔ مقامِ تُو سے اخراج کے یہی دو ہی وسائل ہیں۔ وسیلہ اتصال لذید جبکہ وسیلہ افتراق شدید ہوتا ہے۔ افتراق کی ایک ادنیٰ سی جھلک ایک شاعر کچھ یوں بیان فرماتا ہے۔

گُل ہوس پاؤں نہ رکھیو کبھی اس راہ کے بیچ
کوچہ عشق ہے یہ رہ گزرِ عام نہیں

مقامِ تُو سالک کیلئے جہاں فرحت بخش ہوتا ہے وہاں اس کا دوسرا رُخ نہایت کرب آمیز بھی ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو افتراق بین الوجود تک پہنچتے پہنچتے سالک اپنا حسی توازن تک کھو بیٹھتا ہے۔ قضیہ اتصال پر آ کر رُکے یا افتراق پر، بہرحال مقامِ تُو سالک کو آگے ضرور دھکیل دیتا ہے۔ ہم بارہا عرض کر چکے ہیں کہ طریقت کا مسافر پنچھی واس کی مانند ہوتا ہے اور اُس کی بقاء، ارتقاء میں ہی مضمر ہوتی ہے۔

عشقِ وجودیہ
اتصال مع الوجود
افتراق بین الوجود
انتہائی لطف
مقنوط عن الوجود
مہجورِ فطر
مہجورِ جبر
اسفار الی الروح
اسفار الی الروح
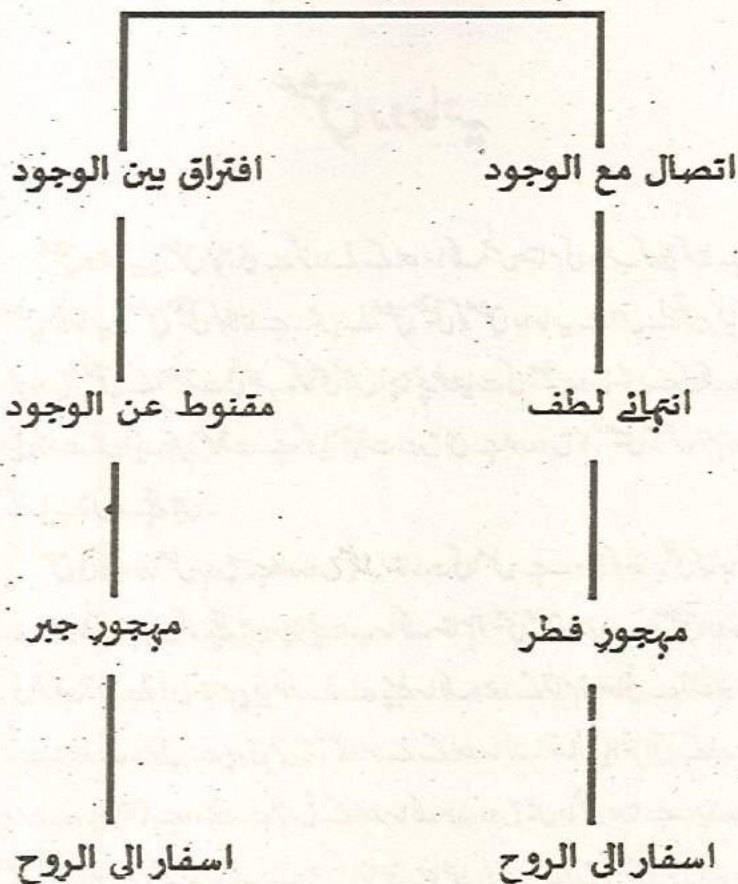
عشقِ روحانیہ

عشقِ وجودیہ یا عشقِ مجازی سے گزرنے کے بعد سالک جس مقام کی جانب کوچ کرتا ہے وہ عشقِ روحانیہ یا عشقِ حقیقی کہلاتا ہے۔ میں نے عشقِ حقیقی کو عشقِ روحانیہ سے اس لئے تعبیر کیا کہ بجز روح مطلق کے، حقیقت فی نفسہ کچھ بھی نہیں، چنانچہ طبیعیات کی اصل روح یہی ہے کیونکہ روح اپنی ذات میں ایک مجرد حقیقت ہے، گویا حقیقت روح ہی ہے اور روح کا تفصیلی تذکرہ ہم روح کے باب میں کر چکے ہیں۔

حق کی بنیاد دراصل روح ہے اور روح منجملہ مقامات کی اصل ہے۔ روح کو جذبہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، چنانچہ جب سالک مقامِ تُو یعنی عشقِ وجودیہ سے عشقِ روحانیہ کی طرف آتا ہے تو اس مقام پر قیام کرنے سے پہلے سالک وجود کے تمام تر معانی سے آشنا ہو جاتا ہے۔ وجود کے ماحول سے پوری طرح آگاہ ہونے کے بعد سالک اتصال یا افتراق کے ذریعے وجود سے باہر نکلتا ہے، وجود سے فراغ کے بعد سالک حیطہِ روح میں داخل ہوتا ہے۔ حیطہ روح میں داخل ہونے کے بعد سالک اب وجود کی تمام تر رعنائیوں کو دُسرا کر روح کی پہلی منزل میں مدغم ہو جاتا ہے۔ عشقِ روحانیہ دراصل حواس سے ماوراء ایک ایسا علاقہ ہے جہاں پر مشاہدہ، ادراک اور معلوم ومحسوس اپنے تمام تر رخت ولوازم کے ساتھ رخصت ہو جاتے ہیں۔ سالک کی نظر بلاغت کے اُس مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں پر حصول وخیار بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ اس مقام پر سالک کیلئے اُس کا منبع نظر اتصال وافتراق سے ماوراء ہو جاتا ہے اور جہاں پر سالک ندائے عام لگاتا

ہے۔ قطع نظر اس سے کہ محبوب کی جانب سے کوئی التفات ہو یا نہ ہو، عشق روحانیہ کے اس مقامِ اگن کو حضرت امیر خسرو نے کچھ یوں بیان فرمایا:

موسے بول نہ بول موری سن یا نہ سن
میں تو توہے نہ چھاڑوں گی اے سانورے

حضرت امیر خسرو کہنا یہ چاہتے ہیں کہ "اے محبوب اب تُو مجھ سے بول یا نہ بول، میری فریاد سن یا نہ سن بہر حال میں آپ سے دور نہیں جاؤں گا۔"

عشق روحانیہ وہ مسلسل تڑپ ہے جس کو سالک اپنی نجات کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ اس مقام کے اسرار و رموز اُس وقت تک منکشف نہیں ہو سکتے جب تک کہ سالک مقامِ تُو سے کماحقہٗ نبرد آزما نہیں ہو جاتا۔ اس مقام کو الفاظ کے روپ میں پیش کرنا محض ایک رہنمائی ہے جب تک کہ سالک اس مقام پر مقیم نہیں ہو جاتا تب تک اس کے ماحول سے کماحقہٗ آشنا نہیں ہو سکتا، بلبلِ ہند حضرت امیر خسرو اس مقام کے رموز و اسرار کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

ہردے میں سے جاؤ گے تب مرج بدوں گی توہے

"اے دوست جب عشق وجود یہ میں سے گزر کر یہاں پہنچو گے تب آپ کو بتاؤں گا کہ یہاں پر کیا کچھ پیش آتا ہے۔"

سالک کیلئے یہ مقام اب مسلسل جنون بنتا جا رہا ہوتا ہے۔ ایک غیر مشروط تڑپ سالک کو اس مقام پر کرب آمیز کیفیات سے دوچار کرتی ہے۔ دردِ مسلسل سالک کو اس مقام پر پوری طرح اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر سالک، درد کی ایک بالکل نئی دنیا سے آشنا ہوتا ہے۔ اس درد کو ہمارے عہد کے ایک ذہین صوفی شاعر سید نصیر الدین نصیر گولڑوی علیہ الرحمہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

نقش برآب نہیں رحم نہیں خواب نہیں
آپ کیوں کھیل سمجھتے ہیں مٹانا دل کا

مقامِ عشقِ روحانیہ پر سالک کے پاس نہ تو حسی وسائل موجود ہوتے ہیں اور نہ ہی شعور کی تجزیاتی قوت۔ پس سالک اسی عالمِ ہُو میں ایک نئی منزل کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس مقام پر سالک کے پاس جنون کے سوا کچھ نہیں باقی رہتا، جنون بھی بالکل سپاٹ، جس میں نہ کوئی آرزو ہے اور نہ ہی تمنا، بس ایک استجاسی اضطرابِ مسلسل ہے جو سالک پر ہمہ وقت طاری رہتا ہے۔ اسی الم میں مبتلا سالک پکھی واس کی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوتا ہے۔ عشقِ روحانیہ کے اس اذیت ناک محل کو حضرت سائیں بابا فرید علیہ الرحمہ بڑی جامعیت سے بیان فرماتے ہیں:

آیا بھار برہوں سر بھاری
لگی ہو ہو شہر خواری
روندے عمر گزاریم ساری
نہ پایم ڈس منزل دا

"اے فرید! محبوب کے فراق کا بھاری بھرکم بوجھ اپنے سر پر آن پڑا جس کے سبب شہر شہر رسوائی ہو رہی ہے، پس اسی طرح روتے ہوئے عمر گزر گئی لیکن کسی مطلق منزل کا سراغ نہ مل سکا۔"

بابا فرید سائیں کے درج بالا بند میں دراصل عشقِ روحانیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اب وجود کے معانی آشکار ہونے کے بعد اگلی منزل کا سراغ نہیں مل رہا، پس سراغ نہ ملنے کی صورت میں دربدر بھٹکنے سے شہر شہر جو رسوائی ہو رہی ہے اُس کا بھی درد ہے اور نارسائی کا بھی کرب، سلوک کی تمام منازل میں سے سب سے اذیت ناک منزل سالک کیلئے یہی عشقِ روحانیہ یا عشقِ حقیقی ہے۔ اکثر سالکین کرام کے پاؤں اس منزل پر ڈگمگا جاتے ہیں، چنانچہ اکثر و بیشتر سالکین کرام بظاہر اس مقام پر ہذیان (Hallucination)، انفصام (Schizophrenia) اور سوداویہ (Melancholia) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مرزا اسداللہ خاں غالب اس کیفیت کو کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اس مقام پر سالک کے کے گرد دردوالم کا ہالہ دن بدن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اگر عزم واستقلال کی قلت ہو تو اکثر سالکین اس مقام پر اپنا شریر بھی تیاگ دیتے ہیں۔ اسی کیفیت کو ایک اور صوفی منش شاعر سید میر تقی میر کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مدوا ہے اس آشفتہ سری کا

بلاشبہ اگر سالک اس مقام پر ڈگمگا جائے تو انتقالِ طبع فوری طور پر اس کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے کیونکہ اس مقام پر سالک کیلئے سانس لینا بھی کسی اذیت سے کم نہیں ہوتا۔ گویا موت و حیات کی ایک عجیب کشمکش میں دھرا سالک اس پُر آشوب مقام پر قیام کیئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کرب آمیز کیفیت کو حضرت سائیں بلھے شاہ سے بہتر کون بیان کرسکتا ہے:

اب لگن لگی کی کریئے
نہ جی سکئے نہ مریئے
بلھے پہ آئی مصیبت بھاری
کوئی کرو ہماری کاری
ایہو جئی دکھ کیسے جریئے
نہ جی سکئے نہ مریئے

بلھے شاہ فرماتے ہیں کہ ”جنوں کی ایسی چاہ لگی کہ اب سمجھ نہیں آرہی کہ کیا کروں، جینا بھی محال اور مرنا بھی مشکل، مجھ پر ایسی کڑی مصیبت آن پڑی کہ کاش کوئی ایسا ہو جو مجھے اس کیفیت سے باہر نکال سکے کیونکہ اس قسم کی کرب آمیز کیفیت برداشت سے باہر ہے۔“

مقامِ عشقِ روحانیہ پر سے گزرنا ایک انتہائی مشکل امر ہے۔ سالک اگر اس مقام پر سے گزر جائے تو بہت جلد دردوالم کا یہ ہالہ بھی ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ عشقِ روحانیہ دراصل جنوں کی حدود سے اتصال کا نام ہے۔ ایک بار سالک جب اس مقام سے باہر نکل آئے تو پھر آگے کی تمام منازل اُس

کیلئے وجدوسرور کی راہیں منکشف کرتی جاتی ہیں۔سالک کو اس مقام پر صرف مصمم عزم و استقلال ہی اس مقام کے تمام ترپیچ وتاب سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔نہیں تو سالک اضمحلالِ طبع کا شکار ہو جاتا ہے۔پس سالک جب اس مقام سے باہر نکل کر آگے بڑھتا ہے تو لامحالہ وہ کچھ ایسی کیفیت میں ہوتا ہے۔

عالمِ ذات میں درویش بنا دیتا ہے
عشق انسان کو پاگل نہیں ہونے دیتا

جیسے ہی سالک اس مقام سے باہر نکلتا ہے آگے کی منزل اُس کی راہ دیکھ رہی ہوتی ہے، چنانچہ سالک کا اگلے مقام میں داخل ہوتے ہی درد کا دریا ماند پڑ جاتا ہے۔دریائے درد کی لہریں اب اضطراب کی بجائے جذم میں تبدیل ہو جاتی ہیں کیونکہ سالک مقامِ عشقِ روحانیہ کے سرنگ سے باہر نکل آتا ہے۔سالک کی اس کیفیت کو معروف سندھی صوفی حضرت سائیں عبدالوہاب المعروف سچل سرمست رحمتہ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں۔

یار سچل ثوں لتھے کشالے
گھونگھٹ کھولڑاں بہے بہے بولڑاں

''سچل کی ذات سے عشقِ روحانیہ کا اضطراب دور ہوا اور وجدوسرور کی ایسی دنیا میسر ہوئی جس میں بے پناہ لطف پوشیدہ ہے۔''

سالکین کے اسی مقام کو حضرت سائیں بلھے شاہ بھی اپنے الفاظ میں پروتے ہیں:

بلھے شاہ گھر میرے آیا
کر کر ناچ ویکھاں لیں یار

''اے بلھے شاہ! تجھے طویل درد کے بعد اپنی منزل مل گئی ہے گویا جس کی طلب میں سرگرداں تھا وہ مجھے مل گیا ہے چنانچہ اب سرور کے اس عالم میں رقص کرنے کو من کر رہا ہے۔''

عشقِ روحانیہ منازلِ عشق کی سب سے کٹھن منزل ہے کیونکہ اس کا تعلق براہِ راست جنون کے

علاقہ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سالکین کا اس مقام پر جنون سے پیچھا چھڑانا پھر مشکل ہو جاتا ہے اور پھر اسی کی انتہاء انتقالِ طبع کا موجب بن جاتی ہے۔ عشقِ روحانیہ کے بعد سالک جس مقام کی جانب رواں ہوتا ہے وہ نہایت اہمیت کا حامل مقام ہے۔ مقامِ عشقِ محمد کریم ﷺ، جس کا ادنیٰ و اولیٰ دعویٰ قریباً ہر شخص کرتا ہے لیکن صحیح معنوں میں عشقِ محمد کریم ﷺ کا حق صرف مسلسل تپسیا کا حامل سالک ہی ادا کرسکتا ہے۔ عامی الفاظ کا سہارا لے کر عشقِ محمد کریم ﷺ کا دعویٰ کر لیتے ہیں اور صاحبِ علم بھی اپنے علم کا سہارا لے کر عشقِ محمد کریم ﷺ کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں لیکن عشقِ محمد کریم ﷺ کی روح تک پہنچنا ایک کہنہ مشق سالک ہی کے بخرے میں آیا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم عشقِ روحانیہ سے عشقِ محمد کریم ﷺ کی جانب کوچ کریں، اپنے صوفی شاعر حضرت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال علیہ الرحمہ کے چند اشعار پیش کر لیتے ہیں جن میں آپ نے منازلِ عشق کی جانب اشارہ کیا ہے:

عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام ، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم ، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشقِ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم

مقامِ عشقِ روحانیہ کے بعد سالک کی اگلی آرامگاہ عشقِ محمد کریم ﷺ ہوتی ہے، عشقِ محمد کریم ﷺ ہی دراصل وہ مقام ہے جس کی بنیاد پر سالک اپنی سانسوں کو جواز بخشتا ہے۔ گویا عشقِ محمد کریم ﷺ دراصل سالک کیلئے جینے کا جواز بن جاتا ہے کہ سالک جن مقامات سے گزر کر یہاں تک پہنچا، مسلسل کرب کے بعد اعصاب اس قدر مضمحل ہو چکے کہ اگر عشقِ محمد کریم ﷺ کا سہارا نہ ملتا تو یقیناً سالک ایک قدم بھی آگے نہ چل پاتا۔ یہ مقام سالک کیلئے زندگی کا ایک روح پرور پیام لے کے آتا ہے۔ اس خوبصورت کیفیت کو ایک عاشق کچھ یوں بیان کرتا ہے:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تم ہی تو ہو

ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تم ہی تو ہو

منازلِ عشق میں سے سالک کیلئے مقامِ عشقِ محمد کریم ﷺ سے بڑھ کے فرحت بخش اور خوبصورت مقام اور کوئی نہیں، کیونکہ عشقِ محمد کریم ﷺ دراصل مذہب کا اصل الاصول اور دین کی حتمی بنیاد ہے، اس کے بغیر دین کی کوئی بھی صورت قابلِ قبول نہیں۔ عشقِ محمد کریم ﷺ کا دعویٰ عامی سے لے کر عالم تک کر لیتے ہیں لیکن عشقِ محمد کریم ﷺ کی چاشنی صرف سالکین کرام کے بخرے میں آتی ہے، وہ جنہوں نے ایک طویل جدوجہد کے بعد اس مقام پر پڑاؤ ڈالا، اُن کیلئے یہ مقام فردوسِ بریں سے کم نہیں ہوتا، حتیٰ کہ بعض اوقات تو سالکین کرام صہبائے عشقِ محمد کریم ﷺ میں پُرسرور ہو کر دونوں جہان سے غافل ہو جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ ہماری بہشت ہے تو

بس یہی ہے۔ جمالیات سے لبریز اس کیفیت کو حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ سے بہتر کون بیان کرسکتا ہے:

زے قید دو جہاں آزاد گشتم
اگر تُو ہم نشیں مہ مندہ باشی

مفہوم اس کا یہ ہے کہ "اے محبوب اگر تُو میرے ساتھ ہے تو پھر مجھے کسی بھی جہان کے حوادث کی فکر نہیں۔"

منازلِ عشق میں سے سب سے پُرسکون اور راحت آمیز مقام عشقِ محمد کریم ﷺ ہے۔ سالک کیلئے یہ مقام بلاشبہ بہشت سے کم نہیں ہوتا، کوئی بھی عامی یا عالم مقامِ عشقِ محمد کریم ﷺ کے لطف سے اس قدر بہرہ مند نہیں ہوسکتا جس قدر ایک سالک اس مقام پر پہنچ کر ہوتا ہے کیونکہ علم کا تعلق عقل سے اور عشق کا تعلق روح سے ہے۔ عقل نارسا اور روح عین امکان ہے۔ چنانچہ علم و حکمت محدود اور عشق لامحدود ہے۔ اسی اہم نکتہ کے خدوخال ایک عاشق کچھ یوں بیان کرتا ہے:

در مذہبِ عاشقاں قرارِ دِگر است
ایں بادہ ناب را خمار دِگر است
آن علم کہ در مدرسہ حاصل گردد
کارِ دِگر است و عشق کارِ دِگر است

ان اشعار کا یہ مطلب ہے کہ "عشق کے مذہب میں عاشق کیلئے قرار کسی اور کیفیت کے تابع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بنت العنب کا خمار کچھ اور ہے، وہ جو علم و حکمت مدرسہ میں حاصل کیا گیا وہ کچھ اور ہے اور یہ جو کیفیت ہے یہ بالکل ایک جدا کیفیت ہے۔ گویا علم عشق کے مرتبہِ لطف تک نہیں پہنچ سکتا۔"

عشقِ محمد کریم ﷺ چند الفاظ کے دعاوی سے ثابت نہیں ہوجاتا، نہ ہی مخصوص شمائل و حرکات کے وقوع سے، عشقِ محمد کریم ﷺ سراپا راحت ہے اور راحت کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب

انسان تھکاوٹ اور مسلسل کرب سے گزرتا ہے۔ مختلف مراحل سے گزر کر جب ایک انسان اُس مقام پر پہنچتا ہے تو اُسے اپنے سابقہ تمام تر دعاوی فقید الاثر الفاظ کا مجموعہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ سالک کی اس کیفیت کو حضرت علامہ عبدالرحمان جامی علیہ الرحمہ کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:

ز جامِ حب تو مستم ، باز نجیر تو دل بستم

نمی گویم کہ من بستم سخنداں یارسول اللہ

علامہ عبدالرحمان جامی فرماتے ہیں کہ "اے محبوب ﷺ! میں نے آپ کے شرابِ عشق کا جام پی لیا اور اپنے دل کو آپ کی عقیدت میں گرفتار جان لیا، پس نہیں معلوم مجھے کہ اب الفاظ کے کس سحر میں مبتلا ہو چکا۔"

ایمان کا اصل الاصول بھی عشقِ محمد کریم ﷺ ہی ہے کوئی بھی مومن اُس وقت تک صحیح معنوں میں مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ اپنی روح کو عشقِ محمد کریم ﷺ کی لو سے جلا نہ ڈالے، کیونکہ ایمان کی بنیاد دراصل عشقِ محمد کریم ﷺ ہے اگر ایمان کی دولت موجود ہے اور عشقِ محمد کریم ﷺ ناپید تو پھر ایمان کبھی سودمند ثابت نہیں ہو سکتا، اسی اہم اور بنیادی نکتہ کو حدیثِ پاک میں بھی جا بجا بیان کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے: "تم میں سے کوئی بھی شخص اُس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کے نزدیک، میں (محمد کریم ﷺ) اُس کے والدین، اولاد اور تمام تر لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

اسی کیفیت کو حضرت سائیں سلطان باہو سرکار کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

ایمان سلامت ہر کوئی منگے، عشق سلامت کوئی ہو

منگن ایمان شرماون عشقوں ، دل نوں غیرت ہوئی ہو

جس منزل نوں عشق پہنچاوے ، ایمان خبر نہ کوئی ہو

میرا عشق سلامت رکھیں باہو ، ایمانوں دیاں دھروہی ہو

حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں کہ "ہر عام و خاص اپنے ایمان کی فکر کرتا ہے اور خدا تعالیٰ سے

ایمان کی سلامتی طلب کرتا ہے جبکہ عشق (محمد کریم ﷺ) خدا سے کوئی نہیں مانگتا، گویا عشق مانگتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں جبکہ جس منزل پر عشق پہنچاتا ہے، ایمان کی وہاں تک رسائی ہی ممکن نہیں، آپ فرماتے ہیں کہ میرا عشق سلامت رہے یہ میرے لئے کافی وشافی ہے کیونکہ ایمان کی اصل بھی عشق ہی ہے۔""

مقامِ عشقِ محمد کریم ﷺ کی اہمیت اس قدر مسلّم ہے کہ اس کے مقابلہ میں کسی بھی چیز کی وقعت باقی نہیں رہتی، حتیٰ کہ ایمان بھی عشق کے مقابلہ میں ہیچ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کیفیت سے صرف ایک سالک ہی آشنا ہوسکتا ہے۔ انتہائے عشقِ محمد کریم ﷺ کے متعلق[2] حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کا رنگ کچھ یوں ہے:

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنّار نیست

آپ فرماتے ہیں کہ "عشقِ محمد کریم ﷺ کے مقابلہ میں ایمان میرے نزدیک وہ وقعت نہیں رکھتا جو ایک عامی کے ہاں رکھتا ہے کیونکہ میں سراپا عشق میں غرق ہو چکا ہوں۔ میرے لئے اب عوامی سطح پر قیام ممکن نہ رہا۔"

انتہائے عشقِ محمد کریم ﷺ کے اس ارفع مقام کو ڈاکٹر علامہ اقبال اپنے الفاظ میں کچھ یوں پروتے ہیں:

اگر ہے عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافروزندیق

مقامِ انتہائے عشقِ محمد کریم ﷺ ہی مذہب وایمان کا اصل الاصول ہے، باقی آلات فروع ہیں کیونکہ دین وایمان کا محور ومرکز بہرصورت محمد کریم ﷺ ہی ہیں۔ پس آپ سے عقیدت کی انتہاء بلاشک وشبہ نجات کی کلید ہے۔ عشقِ محمد کریم ﷺ کی انتہاء دراصل سالک کو فنا سے دوچار کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم بارہا عرض کر چکے کہ سالک کبھی کسی مقام پر جامد نہیں ہوسکتا کہ یہ اُصول

عشق کے خلاف ہے کیونکہ عشق ازل سے ابد تک بہتے دریا کی مانند جاری وساری رہے گا۔ بہتا پانی اگر رُک جائے تو وہ جوہڑ بن جاتا ہے، اس لئے عشق کا دریا ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ طریقت کی اصل بھی یہی ہے کہ سالک خود کو کسی مقام پر جامد نہ کرے بلکہ بہتے دریا کی مانند رواں دواں رہے کیونکہ حصارِ سکون منازلِ عشق طے کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ غالباً اسی کیفیت کو ڈاکٹر علامہ اقبال نے اپنے الفاظ میں پرویا ہے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

مقامِ عشقِ محمد کریم ﷺ کی انتہاء سالک کو فنا کے مراتب میں داخل کرتی ہے اور اسی کو میں نے فنافی الکریم ﷺ کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔

فنافی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم

اُنس اور عقیدت جب اپنی انتہاء پر پہنچتی ہے تو فنا سے دوچار ہو جاتی ہے۔ یہی حال سالک کا بھی مقامِ عشقِ محمد کریم ﷺ سے گزرنے کے بعد ہوتا ہے۔ عشقِ محمد کریم ﷺ کے بعد سالک کا اگلا قیام مقامِ فنافی الکریم ﷺ پر ہوتا ہے۔ اس مقام کی اہمیت و ہیئت صرف ایک سالک ہی سمجھ سکتا ہے۔ اگر کوئی عامی اس منزل کا ادراک نہیں رکھتا تو اس میں مقام کا کوئی دوش نہیں، مسافر ہی راستوں کے راز و نیاز سے واقف ہوتا ہے اگر کوئی مقیم مسافر کے مشاہدات و تجربات کو سمجھنے سے قاصر ہے تو اس میں نہ راستے کا کوئی قصور ہے اور نہ ہی مسافر کا، بالکل یہی کیفیت مقامِ فنافی الکریم ﷺ کی ہے۔ قاعدہ عام ہے کہ جب ایک چیز شروع ہوتی ہے تو وہ فنا بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ایک مقام کی ابتداء ہوتی ہے تو اُس کی انتہاء بھی قانونِ قدرت کا حصہ ہے کیونکہ انتہاء کے بغیر کوئی ابتداء وقوع پذیر ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا ایک مقام کی انتہاء دوسرے مقام کی ابتداء ہوتی ہے۔ پس عشقِ محمد کریم ﷺ کی ابتداء اگر محبت و عقیدت ہے تو پھر اسکی انتہاء دراصل فنا ہے۔

فنافی الکریم ﷺ سے میری مراد دراصل محمد کریم ﷺ کی محبت میں تحلیل ہو جانے کے ہیں کہ جب تک محبت اپنی انتہاء تک نہیں پہنچ جاتی وہ ہمیشہ ناقص اور مبنی بر سقم رہتی ہے۔ جس کو عام اصطلاح میں ادھوراپن بھی کہا جا سکتا ہے۔

عشقِ محمد کریم ﷺ کی انتہاء دراصل فنافی الحب کریم ﷺ ہے۔ گویا سالک اس مقام پر محمد کریم ﷺ کی محبت میں روحانی بنیاد پر تحلیل ہو جاتا ہے اور جب تک سالک اس مقام تک نہیں پہنچ

جاتا، اُس کی عقیدت تکمیل سے بے بہرہ اور عشق انتہاء سے محروم رہتا ہے۔ سالک کی اسی ارفع کیفیت کو پیرو مرشد حضرت رومیؒ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

ہر کہ پیر و ذاتِ حق نہ یک نہ دید
نے مرید و نے مرید و نے مرید

حضرت رومیؒ فرماتے ہیں کہ "جب تک مرید (عاشق) اپنے پیر (محبوب) کی ذات میں مدغم نہیں ہو جاتا تب تک وہ عاشق نہیں کہلاتا۔"

یہ وہ ارفع مقام ہے جہاں پر عاشق و معشوق کے درمیان دوئی اپنی تمام تر سرو سامانی کے ساتھ فرو ہو جاتی ہے۔ عاشق اپنے محبوب کے عشق میں اُس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں پر عاشق کی ذات دراصل معشوق کی ذات بن جاتی ہے۔ دوئی کی اس لطیف انتہاء کو حضرت مرشدی کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

جملہ معشوق است و عاشق پردہ
زندہ معشوق است و عاشق مُردہ

"ہر کہیں معشوق جلوہ گر ہے میں (عاشق) محلول ہو گیا گویا معشوق موجود اور عاشق معدوم ہے۔"

دوئی کے اس انتہائی کومل اتمام کو صرف ایک سالک ہی کماحقہ سمجھ سکتا ہے۔ سالک کے علاوہ کوئی بھی اس مقام کے اسرار و رموز تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا کیونکہ اس مقام کا ظاہر ایک عامی کیلئے ابہام یا روحانی اذیت کا باعث بن سکتا ہے۔ اس لئے عامی کو سمجھنے کیلئے سلوک کی راہ اختیار کرنا ہوگی، بصورتِ دیگر درک محال ہے۔

مقامِ فنافی الکریم ﷺ پر ہر عاشق اپنی ذات سے ماوراء ہو کر خود معشوق کی ذات میں مدغم ہو جاتا ہے اور پھر اُسے ہر سُو محبوب کے جلوے نظر آتے ہیں۔ نزاکت سے لبریز اس مقامِ رفیع کو حضرت علامہ عبدالرحمان جامی رحمتہ اللہ علیہ اپنے الفاظ میں کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

ہمسایہ و ہم نشیں و ہمراہ ہمہ اُو است
درد لق گداوٗ اطلس شہ ہمہ اُو است
در انجمن فرق و نہاخانہ جمع
باللہ ہمہ اُو است ثم ہمہ اُو است

آپ فرماتے ہیں کہ "اے محبوب ﷺ اب تُو قدم قدم پر میرے ساتھ ہے، خلوت وجلوت اور عُسرت ویسرت میں اب تُو ہی تُو ہے، پس تُو ہے میں نہیں پس تُو ہے۔"

مقامِ فنا فی الکریم ﷺ کا ادنیٰ سا بھی ادراک عامی نہیں کر سکتا، اس لئے میں نے ابتداء ہی میں یہ نکتہ عرض کر دیا تھا کہ میرا مقصد صرف اُن سالکین کرام کی عملی رہنمائی ہے جو اس راہ کے مسافر ہیں اور جو عشق کی وادی میں قدم رکھ چکے ہیں۔ عوام کیلئے میں نے ابتدائی ابواب میں رہنمائی کر دی ہے۔ کوئی بھی سلوک کی راہ اختیار کر سکتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی تخصیص نہیں لیکن یہ کوئی ایسا کام نہیں جو انسان کے چاہنے سے ہو جاتا ہے۔ اس کیلئے ایک طویل جدوجہد اور مسلسل تڑپ درکار ہوتی ہے جو ایک سالک کو اس مقام تک لے آتی ہے۔ اگر کسی کے دل میں خلش موجود ہے تو وہ ضرور بالضرور اس مقام تک پہنچ آئے گا، نہیں تو عامی کیلئے اس میں کوئی کشش موجود نہیں کیونکہ کشش درک سے پیدا ہوتی ہے اور عامی درک سے کوسوں دور رہتا ہے۔ شائد اسی لئے ایک مقام پر سیدی ومرشدی حضرت رومیؒ نے فرمایا:

با لبِ دمساز خود گر جفتے
ہم چوں نے من گفتنِ نہا گفتے

اس کا مطلب یہ ہے کہ "عوام کے سامنے میں مقامِ فنا کے اسرار کیسے عیاں کروں کاش کہ اس سفر میں میرا کوئی دمساز ہوتا۔"

انتہائے مقامِ فنا فی الکریم ﷺ کے بعد سالک جس مقام کی طرف بڑھتا ہے وہ ہے دراصل اتحاد اور اتحاد سے مراد ذاتِ عین میں مطلق ادغام ہے جو کہ اصل توحید اور تصوف کا مغز ہے،

تصوف کالب لباب درحقیقت درکِ وحدت ہے ادراکِ وحدت کے بغیر تصوف کی روح تک پہنچنا ممکن نہیں،۔ سالک مقامِ فنا کے بعد صحیح معنوں میں موحد بن جاتا ہے اسی کی مزید تفصیل ہم اگلے باب میں بیان کرر ہے ہیں۔

وحدت الوجود

وحدت سے مراد دراصل عاشق و معشوق کا ایک ہو جانا ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم مقام ہے جہاں تک رسائی بہت ہی شاذ ہوگئی ہے۔ سالک جب ذاتِ عین میں ادغام کر لیتا ہے تو اب اُس کا مستقل قیام وحدت پر ہوتا ہے۔ وحدت الوجود کو انگریزی اصطلاح میں (PANTHEISM) کہا جاتا ہے۔ اس مقام پر میں اور تُو کا فرق اپنی پوری سر و سامانی کے ساتھ فرو ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر ایک سالک کو اپنے محبوب کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا ہوتا اور وہ ہمہ وقت وحدت میں غوطہ زن رہتا ہے۔ اس مقام کی کیفیت کو حضرت سائیں سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

وحدت دا دریا الٰہی عاشق لیندے تاری ہُو

مارن ٹبیاں کڈھن موتی آپو اپنڑی واری ہُو

حضرت سائیں سلطان باہو فرماتے ہیں کہ "دوئی کے خاتمہ کے بعد اب میں وحدت یعنی میں و تُو کی یکتائی کے دریا میں غوطہ زن ہوں اور یہاں سے میں انمول جواہرات یعنی (نادر مشاہدات و تجربات) لے رہا ہوں اور اسی سبب میں اپنی روح کے صدقے واری ہو رہا ہوں جس نے مجھے یہاں تک پہنچایا۔"

یہ وہ مقام ہے جہاں پر ایک سالک محبوب کی ذات میں کماحقہ مدغم ہو کر اپنے وجود سے منزہ ہو جاتا ہے۔ گویا اُس کی نظر صرف ایک ہی ذات پر قیام کرتی ہے اور وہ ہے اُس کے محبوب کی

ذات ، علاوہ ازیں کسی خالق ومخلوق کا ادراک ممکن نہیں رہتا بلکہ اس معاملہ میں سالک بالکل لاادیت کی منزل پر کھڑا ہوتا ہے۔اسی لازوال حقانیت کو جد العارفین شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن العربی نے کچھ یوں بیان فرمایا:

العبد رب والرب عبد

یالیت شعری من المکلف

''میں نہیں جانتا کہ کون بندہ اور کون خدا ہے گویا میں تو صرف ایک ہی وجود کو جانتا ہوں اور وہی حق ہے،اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا،کاش کے اسکے علاوہ بھی میں کچھ جان لیتا۔''

وحدت الوجود دراصل اسلام کی روح ہے۔جب تک ایک انسان وحدت کے دریا میں غوطہ زن نہیں ہو جاتا وہ حق کے ادراک سے اجنبی ہی رہتا ہے کیونکہ حق صرف اور صرف توحید میں مضمر ہے۔

وحدت الوجود کو ہمارے قدیم فارسی صوفیائے کرام ہمہ اُواست سے بھی تعبیر کرتے رہے ہیں۔یعنی ظاہر اور باطن میں صرف ایک ہی وجود،گویا کثرت فریب محض ہے۔شیخ اکبر حضرت ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''اشیاء کی کثرت ظہور کے لحاظ سے عین ہے ذات کے لحاظ سے نہیں،گویا ذات ایک ہی ہے۔''

وحدت الوجود کی سب سے اہم اور مضبوط قرآنی دلیل یہ کہ''قل ھو اللہ احد''(فرمادیجئے کہ وہ ذات ایک ہی ہے)چنانچہ ثابت ہوا کہ وہی ذات ذات عین ہے۔علاوہ ازیں فریب محض اور فانی ہے۔اسلام کی بنیاد توحیدِ مطلق گویا وحدت الوجود پر قائم ہے۔ایک خالص موحد صوفی ہی ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے مردِ مومن بھی صوفی ہی ہوتا ہے کیونکہ صوفیائے کرام سے بڑھ کے موحدین کوئی نہیں ہو سکتے۔اُنہوں نے توحید کا یہ سفر خود چل کے طے کیا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ توحید کی قدر ومنزلت ایک صوفی سے بڑھ کے کوئی نہیں جان سکتا۔وحدت کے

اس مقامِ آفریں کو پیرومرشد حضرت رومی رحمتہ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

دو مگوئے و دو مخواں و دو مداں
بندہ را در خواجہ خود محوداں

آپ فرماتے ہیں کہ "دو نہ کہہ دو نہ پڑھ اور دو نہ جان گویا ایک ہی ہے۔"

وحدت کا ثبوت قدیم ترین سنسکرتی مذاہب میں بھی ملتا ہے۔ رگ وید کے اُپنشد میں ایک وِدوان میجنا والکیہ کہتا ہے کہ "آتما (انفرادی روح) براہم (کُل) میں جذب ہوگی تو انفرادی شعور مٹ جائے گا اور جزو (آتما) جو عارضی طور پر کُل (براہم) سے جدا ہوا تھا، دوبارہ اس میں ضم ہو جائے گا جس طرح بہتا ہوا دریا سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔"

نظریہ وحدت کی صہبا سے کبائر صوفیائے کرام، صلحاء اور عارفین رحمہ اللہ علیہم میں سے سیدی و مرشدی حضرت جلال الدین رومی، زبدۃ العارفین سیدی و سندی حضرت حسین ابن منصور الحلاج، جد العارفین حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، شیخ صدر الدین قونوی، شیخ عبدالکریم جیلی، شیخ عبدالرزاق جھنجانوی، شیخ امان اللہ پانی پتی، سیدی شمس الدین تبریز، حضرت شیخ فخر الدین عراقی، شیخ فریدالدین عطار، شہید حق حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی، حضرت شیخ شرف الدین المعروف بوعلی قلندر، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت خواجہ یمین الدین المعروف امیر خسرو دہلوی، خواجہ سید محمد گیسو دراز شاہ، خواجہ فریدالدین مسعود شکر گنج، خواجہ عبداللہ احرار، حضرت خواجہ باقی باللہ کابلی، حضرت خواجہ شاہ سلیمان تونسوی، شیخ عبدالرزاق کاشی، حضرت علامہ عبدالرحمان جامی، حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی، حضرت سائیں سلطان باہو، حضرت سائیں عثمان مروندی المعروف لال شہباز قلندر، حضرت سائیں عبداللہ المعروف بلھے شاہ، حضرت شیخ سعید المعروف سرمد سرمست، حضرت سائیں بابا غلام فرید چاچڑاں والا، حضرت سائیں میاں محمد بخش، حضرت سائیں شاہ عبداللطیف بھٹائی، حضرت سائیں وارث شاہ، حضرت سائیں عبدالوہاب المعروف سچل سرمست، حضرت سائیں شیخ عثمان المعروف شاہ حسین مادھو لال، علمائے مدینہ منورہ میں سے حضرت شیخ ابراہیم کروی اور مشائخ مکہ معظمہ میں سے

شیخ حسام الدین علی نقی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شیخ عبدالرزاق محدث دہلوی، حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی، حضرت شاہ نیاز بریلوی، حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی، حضرت امداداللہ مہاجر مکی اور حضرت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے علاوہ سینکڑوں مقدس نفوس مخمور تھے۔

مقامِ وحدت الوجود پر سالک دوئی کی ہر صورت سے منزہ ہو کر جمالِ یار کا عکس لئے توحید کے اُس مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے جو کائنات کی اصل اور موجودات کا مبداء ہے۔ مقامِ وحدت پر قیام کے بعد سالک تین صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ اعلانِ حق، سکوتِ مطلق اور وجد و سرور۔

اعلانِ حق سے مراد دراصل وحدت کا اعلان جبکہ سکوتِ مطلق تجاہلِ عارفانہ اور وجد و سرور یعنی جذب و مستی جو سیدی و مرشدی حضرت رومی علیہ الرحمہ کا مسلک اور مجذوب کا مطمحِ ہے۔ مقامِ وجد و سرو میں کمال شائستگی اور لامحدود لطف ہے۔ ہمارے اکثر مصلحت پسند صوفیائے کرام مقامِ وحدت پر سالکین کیلئے سکوتِ مطلق کی نصیحت چھوڑ گئے ہیں اور خود بھی صوفیائے کرام کی اکثریت سکوت کو ہی ترجیح دیتی رہی لیکن چند عظیم نفوس اسکے برعکس سکوت کو غیر ضروری اہتمام قرار دے کر اعلانِ حق کو اپنی زبان پر لاتے رہے ہیں۔ وہ صوفیاء جنہوں نے سکوت کو ترجیح دی اُن میں سے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی کا نام سرِ فہرست ہے۔ اسکے برعکس سیدی و سندی حسین ابن منصور اعلانِ حق کو زبان پر لانے والے پہلے صوفی بزرگ تھے، وجد و سرور سیدی رومی علیہ الرحمہ کا مسلک ہے جس کو نہ صرف اہلِ اسلام بلکہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے ہاں بھی یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ اسی اہم فلسفہ کی جانب حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے اہلِ اسلام کی توجہ دلانا چاہی۔ آپ فرماتے ہیں:

وقت است کہ بگشایم میخانۂ رومی باز
پیرانِ حرم دیدم در صحنِ کلیسا مست

اقبال فرماتے ہیں کہ "وقت آ گیا ہے کہ اب میخانۂ رومی (حضرت رومی علیہ الرحمہ کے فلسفہ)

کو اُمت میں عام کیا جائے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اسکی اہمیت نہ صرف اہلِ اسلام کے ہاں مسلم ہوتی جا رہی ہے بلکہ دیگر مذاہب کے حاملین بھی اس طرف توجہ دے رہے ہیں۔"

عشاق کرام کے لطف کیلئے ذیل میں ہم وحدت الوجود کی بنیاد پر چند اصحابِ وحدت کا منظوم کلام پیش کر رہے ہیں:

سیدی و مرشدی حضرت رومیؒ

من خرق گرد کردم عریاں خرابم
خوردم ہمہ رخت خود مہماں خرابم
من مرغ لاہوتی بدم دیدم کہ ناسوتی شدم
دامش بدیدم ناگہے دروے گرفتار آمدم
ماست و خراب از مئے معشوق الستیم
زاں مست الستیم کہ معشوق پرستیم

جدالعارفین حضرت شیخِ اکبر محی الدین ابن عربیؒ

لا آدم فی الکون ولا ابلیس
لا ملک سلیمان ولا بلقیس
فالکل عبارۃ وانت المغنی
یا من ھو للقلوب مقناطیس

حضرت سیدی وسندی حسین ابن منصور حلاجؒ

مزجت روحک فی روحی کما
تمزج الخمرۃ بالماء الزلال
فاذا مسک شیئ مسی

فاذا انت انا فی کل حال

حضرت شیخ حافظ مصلح الدین سعدی شیرازیؒ

ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شرا اولیٰ
دیں دفتر بے معنی غرق مئے تاب اولیٰ
چوں سپر شدی حافظ از میکدہ بیرون رو
رندی و ہوس ناکی عہد عہد شباب اولیٰ

حضرت فخرالدین عراقیؒ

رہ قلندر سزد اریمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی
در خرابات مناں نور خدا مے بینم
دیں عجب میں کہ چہ نورے نہ کجا مے بینم

حضرت شیخ فریدالدین مسعود شکر گنجؒ

من علی یم من ولی یم من نبی
جم نہ یم رستم نہ یم بہمن نہ یم
نور پاکم آمدہ در مشتِ خاک
کورِ چشماں را ولے روشن نہ یم

حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتیؒ

بشکلِ شیخ دیدم مصطفیٰ را
ندیدم مصطفیٰ بل خدا را
زے خود فانی شدم دیدم بقا را

ندیدم غیر ذات خود خدا را

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

من ندانم بادہ ام یا بادہ را پیمانہ ام
عاشق شواہدہ ام یا عشق یا جانانہ ام
اے امین بر مستیم نام تجدو تہمت است
در ازل پیش از زماں تعمیر شدہ میخانہ ام

حضرت سعید المعروف سرمد سرمستؒ

ہر کس کہ سر حقیقتش باور شد
او پہن تراز سپہر پہنا ور شد
ملا گوید کہ بر فلک شد احمد
سرمد گوید کہ فلک بہ احمد شد

حضرت شاہ نیاز بریلویؒ

من پاکباز عشقم ذوق فنا چشیدہ
آہوئے دشت ہویم از موسوای رمیدہ
من اک نورم کہ اندر لا مکاں موجود بودستم
بہ اتسراق خود شاہد و مشہود بودستم

حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ

آستیں بر رخ کشیدہ ہم چوں مکار آمدی
باخودی خود در تماشہ سوئے با راز آمدی
شور منصور از کجا و دار منصور از کجا

خود زدی بانگِ اناالحق بر سرِ دار آمدی

حضرت امداداللہ مہاجر مکیؒ

اگرچہ بے خود و مستم و بے ہوشیار مے گردم
بباطن شاہ کونین ام بظاہر خوار می گردم

حضرت ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ

میری ہستی ہی تھی خود میری نظر کا پردہ
اُٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر

اناالحق

وحدت کی معرفت کے بعد ایک سالک کیلئے اگلا مقام اعلانِ حق ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ مقام انتہائی خطرناک اور پر آشوب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام کی اکثریت یہاں پر آ کر رُک جاتی ہے اور دوئی کو من وعن برقرار رکھ کر سکوتِ مطلق پر قائم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ قابلِ ذکر اکابرین صوفیائے کرام میں سے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی، حضرت شیخ ابوبکر شبلی، حضرت ثوبان بن ابراہیم المعروف ذوالنون مصری اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی و دیگر صوفیائے کرام رحمتہ اللہ علیہم بظاہر دوئی پر مقیم تھے لیکن زبدۃ العارفین سیدی وسندی حسین ابن منصور الحلاج، شیخ الاشراق حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی، عین القضات ہمدانی، حضرت سعید سرمد اور حضرت سائیں بلھے شاہ رحمہ اللہ علیہم بلاشبہ مقامِ اناالحق پر قائم و دائم تھے۔ مذکورہ بالا تمام اصحابِ لاہوت نے ظواہریت کو باطنیت پر ترجیح دے کر رہتی دنیا تک عشاق کرام سے دادِ تحسین حاصل کر لی۔ نعرہ اناالحق کی نسبتِ ارفع چونکہ حضرت سیدی حسین ابن منصور حلاج سے منقول ہے اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس زمرہ میں ہم آپ کے اس مقامِ آفریں پر حوضِ عشق وجنوں میں سے اپنے الفاظ کا حقیر سا نذرانہ ڈال دیں۔

سیدی حسین ابن منصور ایران سے تعلق رکھنے والے ایک جنون الطبع اور بے ضرر انسان تھے۔ آپ دنیاوی طور پر قلاش اور گوشہ نشین انسان تھے۔ آپ کے عقائد شدید اور مطالبات شدید تر تھے آپ کے نزدیک عشقِ روحانیہ کا حامل صاحب یومِ محشر اور عشق سے نابلد مُردہ ہے۔ آپ اپنی تمام

عمر جستجوئے زندگی کے صحراء میں پیاسے جاں بلب انسان کی طرح سرگرداں رہے اور اپنی مضطرب روح کو عشقِ خداوندی میں جلاتے رہے۔ آپ نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ علمِ دین کے حصول میں گزارا۔ اور اپنے وقت کے معروف علماء سے علم و فضل حاصل کیا۔ آپ کے اساتذہ میں سے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی، سہل بن عبداللہ اور عمرو ابن عثمان مکی جیسے جلیل القدر علماء شامل ہیں۔
آپ کے متعلق مشہور تھا کہ آپ عین شباب میں ہی اپنے ہم عمر لڑکوں سے الگ بالکل خاموش اور اپنی ذات میں گم رہتے تھے۔ آپ دنیا و مافیہا سے بے خبر اور ہمہ وقت اضطراب کے عالم میں رہتے تھے۔ آپ کو اکثر دیوانہ کہا جاتا اور لوگ آپ کی اس کیفیت پر ہنستے لیکن آپ لوگوں کے اس رویے پر بالکل خاموش رہتے اور اُن کی باتوں پر بالکل کان نہ دھرتے، اکثر و بیشتر آپ کی زبان پر انا الحق انا الحق جاری رہتا، آپ کے نعرہ انا الحق کے چرچے ہوئے تو لوگوں نے آپ کے منہ سے سُنا کہ "میں تو انا الحق کے سوا کچھ نہیں کہوں گا" اور ساتھ ہی بے خود ہو کر اشعار پڑھتے رہتے۔

مفاہیم

☆ میرے اور تیرے درمیان صرف "میں" حائل ہو کر جھگڑ رہا ہے۔ اپنے لطف و کرم سے اس "میں" کو درمیان سے نکال دے۔

☆ مجھے تجھ پر اور اپنے اُوپر تعجب ہے کہ تُو نے مجھے اپنے ساتھ مشغول کر کے مجھے خود میں فنا کر دیا ہے۔

☆ مجھے خود سے اتنا قریب کر لیا مجھے گمان ہونے لگا کہ تُو "میں" ہے۔

☆ مجھ کو شرابِ محبت پلا کر کہتے ہیں گا نہیں حالانکہ اگر سرات کے پہاڑوں کو یہ شراب پلا دی جاتی تو وہ بھی گانے لگتے۔

☆ آرزو یہ ہے کہ میں اُس کی محبت میں مر جاؤں اور یہ آرزو میرے نزدیک ہر چیز سے زیادہ آسان ہے۔

مختلف علاقوں میں آپ کے ہمنوا اور معتقد پیدا ہو گئے تھے۔ چنانچہ آپ ہی کے ہم عصر ایک

صوفی بزرگ حضرت ابراہیم ابن فاتک بیان فرماتے ہیں کہ ایک دن میں سیدی کے گھر حاضر ہوا تو آپ کو مشغولِ عبادت دیکھ کر خاموش بیٹھ گیا۔ جب آپ فارغ ہوئے تو مجھ سے کچھ ان الفاظ سے ہم کلام ہوئے: "اے بیٹے! بعض لوگ گواہی دیتے ہیں کہ میں ولی اللہ ہوں اور بعض لوگ گواہی دیتے ہیں کہ میں کافر ہوں، جو لوگ مجھے کافر کہتے ہیں وہ لوگ مجھے اور خدا کو اُن لوگوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ جو لوگ مجھے ولی سمجھتے ہیں کہ وہ میرے متعلق حُسنِ ظن رکھتے ہیں لیکن جو لوگ کافر سمجھتے ہیں وہ تعصبِ دین کی بناء پر ایسا سمجھتے ہیں اور جس نے دین میں تعصب کیا وہ اللہ کے نزدیک اُس سے بہتر ہے جس نے کسی کے متعلق حُسنِ ظن سے کام لیا اور ابراہیم تیرا کیا حال ہو گا جب تُو مجھے مصلوب ہوتے، قتل ہوتے اور آگ میں جلتے ہوئے دیکھے گا، بلاشبہ وہ دن میری تمام عمر کے ایام میں مبارک ہو گا۔"

حضرت ابن عبداللہ سے روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "اکثر و بیشتر حضرت شیخ ابو بکر شبلی کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ "میں اور حسین ابن منصور ایک ہی چیز ہیں مگر اُس نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا اور میں نے خود کو پوشیدہ رکھا۔" ابن عبداللہ مزید فرماتے ہیں کہ "سیدی منصور اکثر صوفیانہ رنگ میں اشعار کہتے رہتے تھے۔ ذیل میں ہم آپ کے چند ایک اشعار کا مفہوم بیان کرتے ہیں۔

مفاہیم اشعارِ سیدی ابن منصورؒ

"تیری روح میری روح میں اس طرح گھل مل گئی جس طرح عنبر مشک خالص میں یا شراب صاف پانی میں مل کر ایک ذات ہو جاتی ہے جب کوئی شئے تجھے مس کرتی ہے تو وہ مجھے مس کرتی ہے اور تُو "میں" ہے اور ہم جدا نہیں ہو سکتے کہ تُو ہر حال میں "میں" ہے۔

☆ پاک ہے وہ ذات جس نے پہچانا، سوتی شکل میں اپنی منور لاہوتی ذات کو اور پھر وہ اپنی مخلوقات کے سامنے ایک کھانے پینے والے انسان کی شکل میں ظاہر ہوا۔

☆ جس شخص کو انوارِ توحید نے مست کر دیا ہو وہ تجرید کی عبادت سے روک دیا جاتا ہے۔

☆ جنت کو جانے والا رستہ دو قدموں کا ہے تم صرف دو قدم چل کر اس تک پہنچ سکتے ہو۔ پہلا

قدم یہ ہے کہ دنیا کو اس کے عاشقوں کے منہ پر دے مارو اور دوسرا قدم یہ کہ آخرت کو اسکے چاہنے والوں کے حوالے کر دو۔

☆ اور میں نے کہا کہ اگر تم حق شناس ہو تو اُس کی نشانیاں پہچانو، میں اُس نشانی ہوں۔

انا الحق

اقتلونی یا ثقاتی

الی فی قتلی حیاتی

و مماتی فی حیاتی

و حیاتی فی مماتی

اور یہ اس لئے کہ میں نے حق سے منہ نہ موڑا

مجھے ہلاک کر دو

تختہ دار پر لٹکا دو

میرے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دو

میں اپنے دعوٰی سے منکر نہیں ہوں

روایت ہے کہ حضرت شیخ ابوبکر شبلی نے حضرت ذوالنون مصری کی ایک خاص مریدہ فاطمہ نیشاپوری کو سیدی ابن منصور کے پاس اُس وقت بھیجا جب آپ تختہ دار پر تھے اور آپ کا ایک ہاتھ کاٹ دیا جا چکا تھا۔ فاطمہ نے دریافت کیا: ''سیدی! تصوف کیا ہے:'' آپ نے جواب دیا: ''جس حالت میں اس وقت میں ہوں۔ یہ تصوف ہے۔'' پھر کہا کہ واللہ میں نے بلا اور نعمت میں کوئی فرق نہیں دیکھا اور یہ بھی تصوف ہے۔''

معتقدین کے ایک جم غفیر نے آپ سے دریافت فرمایا کہ سیدی ''عشق'' کیا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ ''تم لوگ اِسے آج، کل اور پرسوں دیکھ لو گے کہ ایک دن میرے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے، دوسرے دن مار دیا جائے گا اور تیسرے دن خاک ہوا میں اُڑا دی جائے گی۔''

سیدی کو جب تختہ دار کی طرف لے جایا رہا تھا تو آپ کی زبان پر ان اشعار کا مفہوم جاری تھا:

"میرے دوستو! مجھے قتل کر دو کہ میری موت میں میری زندگی ہے

دنیوی زندگی میری موت ہے میری زندگی تو موت ہی میں ہے"

اسرارِ انا الحق

"ایک دنیادار جو عالمِ ناسوت میں گرفتار ہے مجھے بُرا بھلا کہتا ہے، البتہ دائرہ ملکوت تک پہنچ جائے تو وہ میرا منکر نہیں ہوگا اور جس پر عالمِ جبروت کے اسرار کھل جائیں تو وہ مجھے ایک عالمِ ربانی کہے گا۔ اس سے بھی اُوپر ایک عالم ہے جسے عالمِ لاہوت کہتے ہیں۔ اگر کسی کی رسائی وہاں تک ہو جائے تو اُس پر میرا مقام کھل جاتا ہے لیکن وہاں وہ میرے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔"

سیدی وسندی حضرت حسین ابن منصور رحمتہ اللہ علیہ

☆قول مبارک پیرومرشد حضرت سیدی جلال الدین رومیؒ☆

"نااہل جب حکمران بنتے ہیں تو ولی اور بزرگ کیا انبیائے کرام علیہم السلام تک کو سولی پر چڑھا دیتے ہیں۔"

وجد و سرور

مقامِ وحدت کے بعد سالک مذکورہ تین مقامات میں سے ایک کی جانب چل پڑتا ہے، مصلحت اندیش سکوتِ مطلق، سرپھرے اعلانِ حق اور متوالے (قلندر) وجد و سرور کی جانب کوچ کر لیتے ہیں۔ مجذوب کا مطمحِ مطلع بھی وجد و سرور ہی ہے کیونکہ مجذوب نے یہ مسلک سیدی و مرشدی حضرت رومیؒ سے پایا۔ یہی وجہ ہے کہ سکوت اور اعلان کی بجائے مجذوب اسی مقام کی جانب رواں کر دیا گیا، وحدت کے بعد سالک کیلئے مقامِ وجد و سرور صحیح معنوں میں سرور کے لوازم پیدا کر دیتا ہے۔ ہمارے ہاں مقامِ وجد و سرور کو عموماً قلندری سے تعبیر کیا جاتا ہے جو کہ بالکل درست ہے، ہم چونکہ مقام ھذا کا تذکرہ خالص علمی بنیاد پر کر رہے ہیں اس لئے ہم نے اس مقام کو عام اصطلاح قلندری کی بجائے مقامِ وجد و سرور سے تعبیر کر لیا۔ اس مقام کی کیفیت الفاظ کے وسیلے سے بیان کرنا سالکین کیلئے محض علمی رہنمائی ہے، نہیں تو حالتِ وجد میں سالک اپنا ہوش و حواس کب کا گنوا چکا ہوتا ہے اور دیوانہ وار مصروفِ گردش رہتا ہے۔ سالک کی اس کیفیت کو سیدی و مرشدی کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

نہ من بے ہودہ گرد کوچہ و بازار می گردم
مذاقِ عاشقی دارم پئے دیدار می گردم

آپ فرماتے ہیں کہ "بے خود ہو کر میرا کوچہ و بازار میں گردش کرنا عبث نہیں بلکہ یہ عشق کا ذوق ہے جس نے مجھے محبوب کے دیدار کی طلب میں چکرا دیا۔"

مقامِ وجد و سرور میں سالک کا ہوش بحال رکھنا قریباً ناممکن ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو سالک اپنے ظاہری احوال سے بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ گویا عقل و ہوش اور احساس اس مقام پر فرو ہو جاتے ہیں۔ سالک کی اس کیفیت کو حضرت شاہ نیاز بریلوی رحمتہ اللہ علیہ اپنے رنگ میں کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

مست گشتم از دو چشمِ ساقیِ مہ خانہ نوش
الفراق اے ننگ و ناموس الوداع اے عقل و ہوش

''محبوب کی طلب نے مجھے بے خود کر دیا چنانچہ اب عزت و آبرو اور عقل ہوش کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی گویا بے خودی ہی اب علاجِ تنگی داماں ہے۔''

اکثر سالکین اس مقام پر بے خود ہو کر رقص میں مصروف ہو جاتے ہیں اور یہ رقص بالکل غیر ارادی ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو دورانِ رقص سالک کو ہوش بھی نہیں رہتا کہ اُس کے وجود کے ساتھ اور ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ سالک کے اس احوال کو حضرت سائیں عثمان مروندی المعروف لال شہباز قلندر رحمتہ اللہ علیہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم
مگر نازم با ایں ذوق کہ پیشِ یار می رقصم

حضرت لال شہباز قلندر فرماتے ہیں کہ ''میں نہیں جانتا کہ دیدارِ محبوب کے وقت رقص کیوں کرنے لگتا ہوں، بہر حال مجھے رقص کرنے پر ناز ہے، جو اپنے محبوب کے حضور کرتا ہوں۔''

مقامِ وجد و سرور سے علاقہ رکھنے والے تمام سالکین کرام رقص میں محو ہو جاتے ہیں اور اُن کی یہ کیفیت بالکل غیر اختیاری ہوتی ہے۔ اس میں سالک کی ذات کا براہِ راست کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ یہ تو بس وحدت کی تڑپ ہوتی ہے جو سالک کو وجد پر مجبور کرتی ہے۔ حضرت سائیں بلھے شاہ اس کیفیت کو کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

تیرے عشق نچایا کرکے تھیا تھیا

"اے محبوب میں نہیں جانتا مگر تیرے عشق نے مجھے رقص کرنا سکھا دیا چنانچہ اب میں محوِ رقص ہوں۔"

مقامِ وجد و سرور پر مقیم تمام سالکین کرام عام اصطلاح میں قلندر کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں کیونکہ وجد و سرور کی کیفیت صرف قلندر پر ہی عیاں ہوتی ہے۔ عامی اس کیفیت کے درک سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات عوامی سطح پر سالکین کرام کو غلبہ جنوں کے باعث زبردست تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن وہ سالک جو اتنی طویل جدوجہد کے بعد اس مقام پر پہنچتا ہے، اُسے ظاہر پرستوں کی ملامت کی کوئی فکر نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اس جانب کان دھرتا ہے۔ سالک کی اس ظاہر متنازعہ کیفیت سے بے اعتنائی کو حضرت سائیں بلھے شاہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

کنجری بنڑن تے عزت نہ گھٹدی
مینوں نچ کے یار مناونڑ دے

"اگر اپنے محبوب کی چاہ میں مجھے طوائف کی طرح ناچنا بھی پڑے تو اس سے میری عزت پر کوئی حرف نہیں آئے گا کیونکہ میرا مقصد اپنے محبوب کی رضا ہے پس اگر وہ مجھے رقص کروا کے خوش ہوتا ہے تو میں بسرِ چشم رقص کرنے کیلئے تیار ہوں۔"

مقامِ وجد و سرور پر سالک ہمہ وقت سرمست رہتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر سالک اپنے آپ سے قطعی طور پر نا آشنا ہو جاتا ہے۔ گویا سالک کا زندہ رہنا دراصل اُس کے محبوب کی بدولت ہوتا ہے اور جب تک سانسیں چل رہی ہوتی ہے، جسم کا رُواں رُواں جذب و مستی میں غرق ہوتا ہے۔ سالک کی اس کیفیت کو حضرت شاہ بو علی قلندر رحمتہ اللہ علیہ اپنے الفاظ میں کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

قلندر بو علیؑ ہستم بنامِ دوست سرمستم
دل اندر عشق اُو بستم ، نمی دانم کجا رفتم

میں (بوعلی) اپنے محبوب کے نام پر سرمست گھوم رہا ہوں کیونکہ میں دل میں اپنے محبوب کی بے پناہ طلب رکھتا ہوں، پس میں نہیں جانتا کہ بے خودی کے اس عالم میں کہاں جارہا ہوں۔"

مقامِ وجد و سرور پر اکثر و بیشتر سالکین کرام پر جنون و دیوانگی کے الزامات لگائے جاتے ہیں اور یہ اُن عامیوں کی جانب سے ہوتا ہے جو اس مقام کے اسرار و رموز سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ چنانچہ سالکین کی اس کیفیت کو ایک صوفی شاعر کچھ بیان فرماتا ہے:

کیوں پاگل پاگل کہتے ہو، اُس یار کا ہوں میں دیوانہ
تم بھی پاگل ہوجاتے ، گر دیکھتے روئے جانانہ

بے خودی کے اس عالم میں سالک نہ صرف اپنی ذات بلکہ کون و مکاں سے بھی ماوراء ہوجاتا ہے۔ افلاک کی بلندیوں کو چھوتا ہوا سالک وجد و سرور میں مدغم ہوکر بے اختیار گھومنے لگتا ہے۔ سالک کی اس کیفیت کو حضرت شاہ نیاز بریلویؒ بہت نفاست سے بیان فرماتے ہیں:

چوں رفت نیاز از خود و زے کون و مکاں برشد
زد نعرہ کہ من بے خود ،خود اُویم و می رقصم

حضرت شاہ نیاز بریلوی فرماتے ہیں کہ "جب میں (نیاز) اپنے آپ سے فرو ہوا اور کون و مکاں سے باہر ہوگیا تو میں نے نعرہ لگایا کہ میں بے خود ہوں اور رقص کر رہا ہوں۔"

منازلِ عشق کی آخری منزل مقامِ وجد و سرور ہے۔ گویا جب تک سالک زندہ رہتا ہے سیدی و مرشدی حضرت رومی کی طرح وجد و سرور میں ہی گم رہتا ہے کہ سالک کے پاس اسکے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا، جو سالکین کرام سکوت اختیار کر لیتے ہیں وہ ظاہر پرستی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں اور اس نہج پر عوام کی مذہبی رہنمائی کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتے ہیں یا پھر کھلی طور پر گوشہ نشین ہوجاتے ہیں۔ مسلکِ سکوت (عوامی رہنمائی) میں سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی اور گوشہ نشینی میں حضرت طیفور عیسیٰ بن سروشان المعروف بایزید بسطامی معروف بزرگ ہیں جبکہ اعلانِ حق کا نعرہ لگانے والوں میں سیدی و سندی حضرت حسین ابنِ منصور، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی،

اور حضرت سائیں بلھے شاہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ علاوہ ازیں مسلکِ وجد و سرور کے بانی رہنما سیدی و مرشدی حضرت جلال الدین رومیؒ ہیں جنہوں نے سکوت اور اعلان کے درمیان مطابقت پیدا کی کیونکہ آپ کے نزدیک سکوت غلاف علی الحق ہے۔ حق کو پردوں میں چھپانا آپ کے نزدیک جائز نہیں اور ویسے بھی حق کبھی نہیں چھپتا۔ حق کی خوبی یہ ہے کہ وہ تاریکی کے سارے پردے چاک کر کے اپنے آپ کو عیاں کر ہی لیتا ہے۔ اس کے برعکس اعلانِ حق عوامی دانش کو رُسوا کرنے کے مترادف ہے کیونکہ اکثریت نہ تو حق تک براہِ راست رسائی حاصل کر سکتی ہے اور نہ ہی ادراکِ حق، پس اعلان کرنے کے بعد عموماً سالک کی طبعی حیات اُس سے چھین لی جاتی ہے اور یہ اعلان جلد یا بدیر سالک کو دار تک لے جاتا ہے۔ سالک کی اسی کیفیت کو حضرت مصلح الدین شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمہ کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

نمازِ زاہداں محراب و منبر

نمازِ عاشقاں بر دار دیدم

"پرہیز گاروں کی نماز دراصل محراب و منبر (مسجد) کے گرد جبکہ سالکین کی تختۂ دار کے گرد ادا ہوتی ہے گویا سالک کو اعلانِ حق زندہ رہنے کا موقع نہیں دیتا۔"

مقامِ وجد و سرور کی بنیاد وہ مخصوص سرود ہوتا ہے جو سالکین کرام بالخصوص سیدی و مرشدی حضرت رومیؒ و بالعموم رسول الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے منسوب ہے۔ اس کو عام صوفیانہ اصطلاح میں "سماع" بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت رومی کے ہاں اس میں (بانسری) اور دف شامل ہے جبکہ ہند میں رسول الہند اور آپ کے خلفاء کے ہاں اس میں ڈھولک اور سارنگی کی آمیزش ہوتی تھی۔ مقامِ وجد و سرور میں سماع کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کیونکہ سالک اس مقام پر پہنچنے کے بعد اپنی زندگی کے دن اسی سماع کے ذریعے بسر کرتا ہے۔ سماع پر بات کرنے سے پہلے ذیل میں ہم منازلِ عشق کا ایک اجمالی جدول پیش کر رہے ہیں تا کہ سالکین کرام کے ذہن میں مقامات کا ایک عمومی خاکہ نقش ہو جائے۔

لا اله الا الله محمد رسول الله
لا
تشکیک
انکار مطلق
بغاوت
لا ادریت
حیرت
الا
ایمان
محمد کریم ﷺ
اتباع
ظاہریت
حب مطلق
عقیدت
عشق
فنا
وجد و سرور
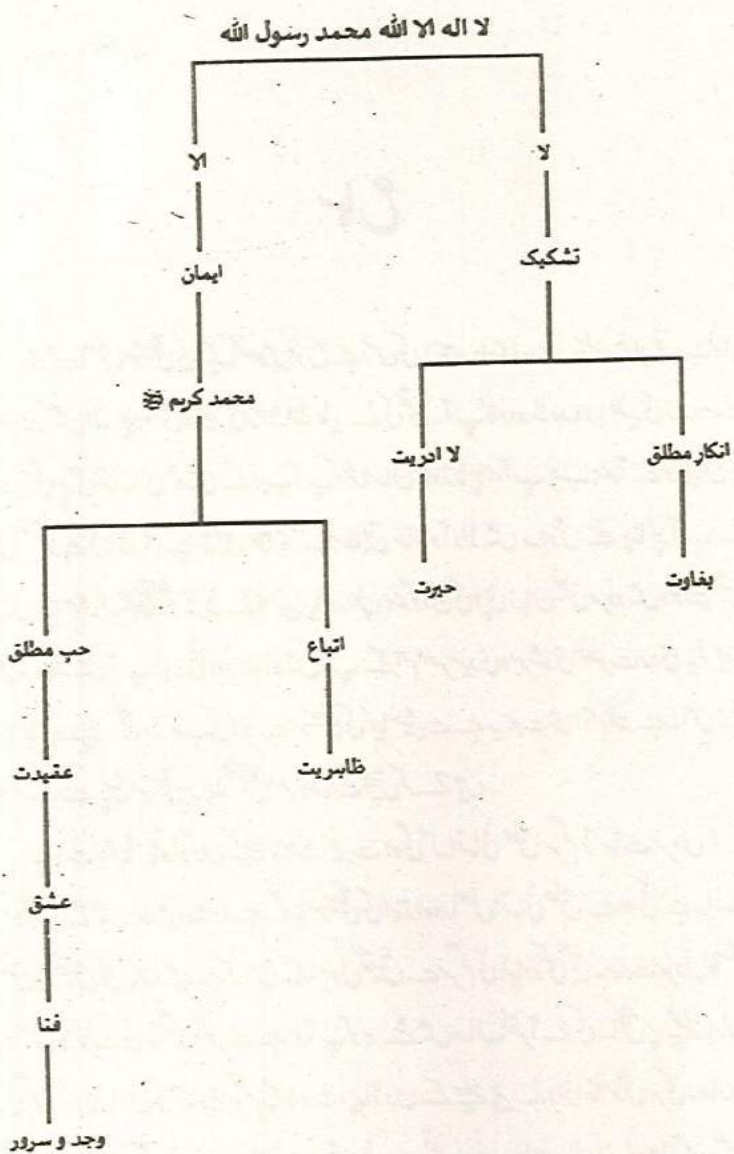
سماع

سماع دراصل موسیقی کی ایک مخصوص نوع ہے جس کی باقاعدہ ابتداء رسول الہند خواجہ غریب نواز حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ نے کی تھی۔ آپ کا دور ملاحدہ و باطنیہ کی زبردست شوریدگی پر مبنی تھا۔ اسی شورش کے سبب آپ کو خراسان چھوڑنا پڑا، آپ جب ہند آئے تو یہاں پر اہلِ سنسکرت (ہنود) اپنے مذہبی عقائد کے مطابق ساز و آواز میں مدہوش تھے چنانچہ آپ نے یہاں پیغامِ محمد کریم ﷺ پھیلانے کا تہیہ کیا اور اہلِ ہند کو اُن کی اپنی زبان یعنی سرود میں دعوتِ عشق دی۔ ہند میں آپ جبکہ بلخ اور بخارہ میں آپ کے ہم عصر سیدی و مرشدی حضرت رومی یہ فریضہ سرانجام دینے لگے، مذہب کی رُو سے موسیقی کی کیا حیثیت ہے یہ بہت ہی اہم نکتہ ہے۔ اس لئے ہم سب سے پہلے موسیقی پر چند تحقیقی معروضات پیش کرتے ہیں۔

یہ بات یقیناً کچھ لوگوں کیلئے باعث حیرت ہوگی کہ انسانی حلق سرگم (سات سروں) کے اصولوں کے عین مطابق بنا ہوا ہے۔ گویا موسیقی کی ابتداء دراصل انسانی حلق سے ہوئی ہے۔ انسانی حلق کی تخلیق ہی کچھ ایسی ہے کہ اس کے اصولِ تخلیق سے سرگم کی بنیاد رکھی گئی۔ سات سروں کا سنگم دراصل کائنات کی عالمگیر فطرت ہے جو آپ کو ہر شے میں صاف نظر آئے گی۔ افق پر مچلتے بادلوں کی گھن گرج، بارش کی تند و تیز چھم چھماہٹ، پہاڑوں کے سینے چیرنے والی خاموش سرکتی دھاروں کی لے، زمین کی گود میں پڑے جھرنوں کے پرفریب رقص سے پیدا ہونے والے دھما دھم ردھم کی پرآشوب صدا دراصل کائناتی موسیقی ہی کی رنگ برنگی دھنک ہے۔ موسیقی کا بنیادی کردار دراصل

انسان کی جمالیاتی حس کی تسکین ہے۔حواسِ خمسہ کے علاوہ انسان کے اندر ایک اور حس بھی موجود ہے جسے جمالیاتی حس کہا جاتا ہے۔جمالیاتی حس کا صدر مقام دراصل انسان کی روح ہے۔یہی وہ حس ہے جس کو بروئے کار لانے کے بعد انسان سراپا لطف بن جاتا ہے۔سیدی و مرشدی حضرت رومی اسی حس کے علمبردار تھے۔تب ہی تو آپ نے صوفیانہ موسیقی کا آغاز کیا۔

یہ سب جانتے ہیں کہ جمالیات اور شعور کا بڑا گہرا رشتہ ہے اگر ادراک جمالیات پر آمادہ نہ ہو تو زندگی پھیکی پڑ جاتی ہے۔یہی وہ جمالیات ہے جس کا عملی مظاہرہ انسان محبت کی صورت میں کرتا ہے۔یہی محبت جب عروج پر پہنچتی ہے تو عشق کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور پھر یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں پر شعور جمالیات کا اسیر ہو کر اپنے اندر سے ادراک کا مادہ ماؤف کر کے انسان کو طلب کی راہ میں اکیلا چھوڑ دیتا ہے۔یہ مقام انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔اس مقام پر پہنچ کر انسان کے سوچنے سمجھنے کی حس سلب ہو جاتی ہے اور انسان تہذیب و تمدن کی تمام حدیں پھلانگ کر حصول طلب کی راہ پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔اس مقام کو ہم اپنی اصطلاح میں مقامِ وجد و سرور بھی کہہ سکتے ہیں۔جمالیات کے اسی اندیشہ کو مدنظر رکھتے ہوئے مذہب اس کا مخالف بن جاتا ہے کیونکہ مذہب کا بنیادی کام ایک ٹھوس اور خشک میکانکی تہذیب وقوع پذیر کرنا ہوتا ہے تاکہ معاشرہ ہر قسم کی افراط و تفریط سے باز رہے۔تاریخِ انسانی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مذہب کی اس بندگلی میں انسان نے ہمیشہ گھٹن محسوس کی ہے اور انسان کی یہ کوشش رہی ہے کہ اس کے اور جمالیات کے آگے تہذیب آڑے نہ آئے تاکہ کوئی تصادم کی صورت پیدا نہ ہو، مگر حقیقت تو یہ ہے کہ تہذیب نے ابتداء ہی سے حسِ جمالیات کے ساتھ کوئی خاطر خواہ رشتہ قائم نہیں کیا۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کا ہر انسان تہذیب سے زیادہ جمالیات کی ہوس ادراک میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔تہذیب نے ہمیشہ سدِ ذریعہ کی بنیاد پر جمالیات کا راستہ روکنے کی کوشش کی جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ انسان محض ایک خشک اور غیر مسکن میکانکی آلہ کی مانند چلنے لگا۔جمالیات کا سدِ باب کرنے کے باعث وہ اپنے لطیف جذبات سے بھی محروم ہو گیا۔اس کا انجام نفرت اور عدم برداشت کی صورت میں پیدا

ہوا جوکہ تحلیل ادراک سے بھی مہلک امراض ہیں، کیونکہ تحلیلِ ادراک کسی بھی صورت میں انسانیت کیلئے مضرنہیں جبکہ نفرت اور عدم برداشت انسانیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔

تصویر کے دورورخ بیان کرنے کے بعداب ضروری ہے کہ ہم ثابت کریں کہ اس میں سے کون سی فکر نے انسانیت کوگزند پہنچایا ہے۔ سب سے پہلے ہم تہذیب بمعنی (مذہب) کو لیتے ہیں۔ تہذیب نے ہمیشہ جمالیات کوکنارے پرلگانے کی کوشش کی یہاں پر ہم اپنی ہی تہذیب اسلام کو لیتے ہیں۔ اسلام نے ابتداء میں تو بالکل وہی رویہ اختیار کیا جوکہ دنیا کی باقی تہازیب نے اختیار کیا۔ مگر یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ اسلامی تہذیب کے نفاذ کے بعد اسی تہذیب نے جمالیات کا رستہ روکے رکھنا بھی گوارانہ کیا۔ چنانچہ تاریخِ اسلامی کے مستند مورخ حضرت سلیمان ابن احمد المعروف طبرانی نے اسلامی تہذیب میں موجود جمالیات کی تسکین کے خدوخال کچھ یوں بیان کیئے:

طبرانی کہتا ہے کہ "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک یتیم لڑکی تھی جسے آپ نے اسے اپنے شوہر کے گھر رخصت کردیا۔ رسول کریم ﷺ کو جب معلوم ہوا تو آپ نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ تم نے کوئی عورت اسکے ساتھ نہ کردی جو دف پر نغمہ سرائی کرتے ہوئے اسکے ساتھ جاتی ۔حضرت عائشہ نے پوچھا کہ وہ کیا گاتی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"اتینا کم اتینا کم ، فحیونا نحییکم ، ولولا الذهب الاحمر ما حلت بواديكم ، ولولا الحنطة الحمراء ما سمنت عذاريكم" (رواہ طبرانی)

علاوہ ازیں اسلامی تہذیب کی ابتداء کرنے والے اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کے متعلق بھی نغمہ نوائی کے تذکرے موجود ہیں ۔ان میں حضرت عبداللہ بن جعفر، حضرت عبداللہ ابن زبیر، حضرت عمر ابن خطاب، حضرت عثمان ابن عفان، حضرت معاویہ ابن سفیان، حضرت عبدالرحمن ابن عوف، حضرت حسان ابن ثابت، حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب، حضرت عبداللہ ابن ارقم، حضرت اسامہ ابن زید، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت عمرو ابن عاص، حضرت ابوعبیدہ بن جراح،

حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عائشہ بنت ابی بکر، حضرت سکینہ بنت حسینؑ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہم کے علاوہ دسیوں اصحاب نبوی کے نام ملتے ہیں (کتاب الرخصہ، البیہقی، ابن ابی شیبہ ، بخاری و مسلم، ابن عبدالبر، ابن قتیبہ، بروایت زبیر بن بکار فی الموفقیات) معلوم ہوا کہ اسلامی تہذیب اپنے دور عروج میں جمالیاتی حس کی تسکین کی قائل تھی، البتہ بعد کے ادوار میں جب اسلامی تہذیب نے انسانی تعبیرات پر مبنی محض ایک میکانکی تہذیب وقوع پذیر کی تو پھر جمالیات کو بھی سدِ ذریعہ کی۔ غیر منطقی اصطلاح کی بھینٹ چڑھا دیا گیا اور پھر وہ وقت دیکھنے کو ملا کہ معروف تابعی حضرت فضیل بن عیاض کے قول "الغنا رقیۃ الزنا" (جس کو عموماً حدیثِ رسول کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے) نے ایک بالکل نئی اسلامی تہذیب کی داغ بیل ڈال دی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایسی غیر منطقی اور تخریب الفطرت روایات سامنے آنے لگیں کہ الامان و الحفیظ، بعد کی اسلامی تہذیب میں جمالیات پر سخت بندش اور اہلِ دانش کے اذہان خشکی کے باعث اہلِ اسلام کو ایک خالصتاً میکانکی اعمال کی جانب دھکیلتے گئے اور پھر جلد ہی نو وارد اسلامی تہذیب میں جمالیاتی حس کی تسکین بالکلیہ حرام قرار دے دی گئی، جبکہ اسکے برعکس اسلامی تہذیب ہی کی گود میں چند ایسے نفوس بھی پیدا ہو گئے تھے جنہوں نے مذہب میں روایات و فقہ کی خشک قیل وقال کے برعکس جمالیاتی حس کی لطیف صنف مسلکِ عشق کا آغاز کیا۔ جمالیاتی حس کی تسکین کا منظم اہتمام سیدی و مرشدی حضرت رومیؒ کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا جبکہ آپ کے پیشرو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری بھی ہند میں اہلِ سرود کے زعیم تھے۔ گویا محدثین اور فقہاء کے میکانکی قوانین کے برعکس یہ لوگ سارا زور اسی جمالیاتی حس کی صنف مسلکِ عشق پر دینے لگے۔ آپ دونوں زعماء نے ارتقائی منازل طے کر کے تحلیلِ ادراک کی راہ ہموار کرتے ہوئے جمالیات کا سکہ منوانے کی کوشش کی۔ ان زعماء کے نزدیک جمالیاتی حس کی تسکین خشک میکانکی اعمال سے بہت بہتر ہے۔ آپ دونوں زعماء کی مسلسل مساعی کے سبب اُس دور کے مذہبی حلقوں میں سماع اور سرودِ حلال کی بازگشت بھی آہستہ آہستہ سنائی دینے لگ گئی۔ چنانچہ بعد میں یہ مسعود طبقہ اہل سماع کے نام سے اسلامی تہذیب

میں اپنا ایک خاص مقام منوانے میں کامیاب ہوگیا۔ اسی طبقہ کے آخری بزرگ حضرت نظام الدین اولیاء المعروف محبوبِ الٰہیؒ کے مرید خاص بلبلِ ہند حضرت امیر خسرو دہلویؒ تھے جنہوں نے نہ صرف موسیقی کی مختلف اصناف ایجاد کیں بلکہ جدید طبلہ اور ستار بھی آپ کی ذہنی صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس تمام تر جمالیاتی مساعی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ دنیا جمالیات کے سبب اسلامی تہذیب کو بسر و چشم قبول کرنے لگی۔ یہاں پر یہ بات کہنا ضروری ہے کہ ہمارے برصغیر میں بھی لوگ زیادہ تر انہی کہنہ مشق اصحابِ جمال کی بدولت آج اسلامی تہذیب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ کسی بھی زمانے میں کسی بھی تہذیب و تمدن میں موسیقی ہمیشہ ایک فطرتی وراثت کی حیثیت سے باقی رہے گی۔ دنیا چاہے جتنی بھی ترقی کرلے اور مذہب جس قدر بھی سدِ ذرائع پیدا کرتا رہے، جمالیاتی حس کی تسکین بہر حال انسان کیلئے خوراک کی طرح ہمیشہ بنیادی ضرورت بنی رہے گی۔ اکابر اصحابِ سماع میں سے سیدی و مرشدی حضرت رومی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت فرید الدین مسعود شکر گنج، حضرت امیر خسرو، حضرت سائیں عبدالوہاب المعروف سچل سرمست، حضرت سائیں عثمان مروندی المعروف لال شہباز قلندر اور حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ علیہم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت امیر خسرو کو تو ہندوستانی و ایرانی موسیقی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ہندوستانی موسیقی میں آپ نے کئی ایک نایاب اختراعات کیں، بالخصوص آلاتِ موسیقی میں ستار، طبلہ اور کئی ایک راگ اور راگنیں آپ نے ایجاد کیں، قول، ترانہ، گل، بسیط، نقش وغیرہ جواب بھی مقبول دھنیں ہیں، حضرت امیر خسرو کی ہی دین ہیں، آج بھی اُن کے بول دل کو بھاتے ہیں۔

راگ مجیر

حضرت نظام الدین اولیاء پیر مشائخ نور
آن پڑے دربار تمہارے خسرو پر کرپا کرو

راگ سازگری

چنگے کام ہوئے آسان ، تن چین پر بیٹھے ہی

دربار ہوئے اپن آرام

اولیاء کے چرن ہوئے شام

تت چین مٹت دِلدّر وھام

راگ فرغانہ

جے جے نظام الدین جگ تارن ، تاپر میں پران کروارن

خسرو کے پربھو، احمد کے پوت تن من اور دھن کروں نثارن

راگ صنم خیال

نجام الدین پیر اولیاء نجام الدین شان اولیاء خسرو

آن پڑے چرنن میں کرپا کرو بھر کبیریا

راگ موافق

بن کے پنچھی بھئے باورے ، ایسی بین بجائی سوانورے

تار تار کی تاد ترالی ، جھوم رہیں سب بن کی ڈالی

پن گھٹ کے پنہاری ٹھاڑی ، بھول گئیں خسرو پنہا بھرن کو

راگ سرپردہ خیال

سلطان جی صاحب نجام الدین اولیاء تو ہے

بل بل جاؤں ،موہے پیر تو سون دیا چرنن تیرے

گئے خسرو پایا میں نے اپنا ایسو پیر مورے تم نجام الدین اولیاء

اس کے علاوہ راگ صنم، راگ غنم، راگ عشاق، راگ موافق، راگ زنگولہ وغیرہ کے بول بھی بے حد مقبول ہوئے۔ حضرت امیر خسرو نے ڈھولک اور طبلے کے لیے جو بول بنائے وہ بالکل

انوکھے اور بے ساختہ دل میں اُتر جاتے ہیں۔اسی طرح انھوں نے فارسی بحور و اوزان کے پیشِ نظر ستر تالیں مرتب کیں۔ ہندوستانی گائیکی میں دھرو، ماٹھا، دھوما اور دھرپد رائج تھے۔آپ نے ترانہ، خیال، قول وغیرہ کو شامل کر کے موسیقی کو کلاسیکی آہنگ اور جدید آہنگ کا ایک خوبصورت سنگم بنا دیا۔اپنے عہد کے اتنے بڑے فنکار تھے کہ آہنگ کے شعور کا اظہار برملا کیا کرتے تھے، باگیری، رام کلی اور سوہنی کو قوالی میں برتا اور اپنے فن کا پُر زور مظاہرہ کیا۔قوالی کو آپ نے اتنا مقبول کیا کہ درباروں سے خانقاہوں تک دھوم مچ گئی اور اُس عہد کے معروف قوال، مطرب، چنگ نواز، زبابی، کمانچی سب مستی میں جھوم اُٹھے۔ہندو پاک میں قوالی کے ماہرین میں سے اُستاد بہاء الدین خان، منشی رضی الدین و پسران (فرید ایاز و ابو محمد)، اُستاد نصرت فتح علی خان، صابری برادران، عزیز میاں اور عابدہ پروین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

رقصِ رومی

رقصِ رومی کتھک، اَتن اور جاز (Jazz) سے بالکل مختلف ایک صوفیانہ کمسن ہے جس کو سیدی و مرشدی نے اپنے دور میں وضع کیا۔ مغرب (West) میں رقصِ رومی کو انگریزی اصطلاح (Sufi whirling) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ سے منسوب سلسلہ کو جلالیہ یا مولویہ کہا جاتا ہے۔ ایشیائے کوچک، شام، مصر اور قسطنطنیہ میں آپ کے مریدین کی اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔

اسلوبِ رقص

سر پر نمد کی ٹوپی کی جاتی ہے جس میں کوئی جوڑ یا درز نہیں ہوتی، مشائخ اس ٹوپی پر عمامہ باندھتے ہیں، خرقہ یا کُرتہ کی بجائے ایک چنٹ دار پاجامہ ہوتا ہے، ذکر و شغل کیلئے حلقہ بنا کر بیٹھا جاتا ہے۔ سماع کی ابتداء نے اور دف سے ہوتی ہے۔ سماع کی آواز سنتے ہی ایک شخص کھڑا ہو کر ایک ہاتھ سینے پر اور دوسرا ہاتھ پھیلائے رقص شروع کرتا ہے۔ دورانِ رقص آگے پیچھے بڑھنا یا ہٹنا نہیں ہوتا بلکہ ایک جگہ جم کر متصل چکر لگائے جاتے ہیں۔ اسی طرح مختلف مجذوب یکے بعد دیگرے اُٹھ کر ایک ہی ساتھ رقص کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

فلسفہِ رومی

سیدی و مرشدی حضرت رومی بلاشبہ قرآن، حدیث، فقہ اور منطق کے بے مثال ماہر تھے۔ آپ نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ تحصیلِ علم میں گزارا اور تیس سال تک درس و تدریس سے وابستہ

رہے۔ ابتدائی عمر ہی سے آپ کو بلخ کے ماہر علماء کا اُستاد مانا جاتا لیکن اپنی مسلسل جدوجہد وسلوک کی منازل طے کرنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے کہ مذہب کا تعلق علم سے نہیں بلکہ جذبہ سے ہے۔ آپ نے انسانی جذبات میں سے تمام آلائشوں کی نشاندہی کر کے ایک ایسا عالمگیر فلسفہ پیش کیا جسے بلاشبہ "مسلکِ عشق" کہا جاسکتا ہے۔ اسلام میں پہلی بار آپ نے عالمگیر تصوف (Universal sufiism) کی بنیاد رکھی جس میں انسان کو تعلیم و مذہب کی بجائے عشق کی جانب اپنی پوری توجہ مرکوز کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اسی فلسفہ کے انتقالِ عام کیلئے آپ نے نظم کا راستہ اپنایا اور اپنے لازوال افکار و مشاہدات کو الفاظ کے کوزے میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بند کر دیا۔ چنانچہ مثنوی کے نام سے موسوم آپ نے 3500 غزلیں اور 2000 رباعیات قلمبند کیں، آپ کے فکر و فلسفہ پر متاخرین سالکین اور مغربی متصوفین نے بہت کام کیا۔ آپ نے اپنے فلسفہ کی بنیاد صرف دو مصرعوں میں سالک کو سمجھادی:

باقی ایں گفتہ آید بے زباں

درد دل ہر کس کہ دارد نور جاں

"جس شخص کے پاس شعور کی روشنی ہوگی، (مثنوی) کا باقی حصہ خود بخود اسکے دل میں اُتر جائے گا۔"

رموزِ مثنوی

اصطلاح مثنوی لغوی اعتبار سے ثنویت کے معنی میں استعمال ہوتی ہے لیکن سیدی نے اس اصطلاح کو ایک مخصوص صوفیانہ رنگ میں استعمال کیا۔ آپ کے ہاں مثنوی سے مراد دراصل "دوئی" ہے گویا یہ جو بظاہر ایک اور دو کے درمیان خلاء پایا جاتا ہے، اسے آپ نے مثنوی سے تعبیر کیا۔ آپ کے نزدیک علم کے اعتبار سے کائنات دوئی میں تقسیم ہے، یعنی یہ جو عموماً خالق و مخلوق کا تصور پایا جاتا ہے۔ یہی دوئی ہے جبکہ یہ اصل میں دوئی نہیں بلکہ وحدت ہے، چونکہ اس اَمر کا ادراک ایک عامی کی دسترس میں نہیں ہوتا اس لئے وہ دوئی کو ہی اصل سمجھنے لگتا ہے۔ آپ نے نظم

کے رنگ میں جابجا اسی اہم نکتہ کو مختلف رنگوں سے پیش کیا کہ کائنات و مابعد الکائنات دراصل وحدت کی بنیاد پر قائم ہے۔دوئی فریب محض اور انسانی شعور کا چکمہ ہے۔یہ وحدت ہے جو مختلف صورتوں میں ایک مخصوص دائرے میں تیر رہی ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

ہر لحظہ بشکلاں بتِ عیار بر آمد
ہر دم بہ لباسِ دِگراں یار در آمد

آپ فرماتے ہیں کہ ایک ہی وجود ہے جو مختلف پرتوں میں گھوم رہا ہے، گویا وہی خالق، وہی مخلوق، وہی عاشق، وہی معشوق، وہی پیر وہی مرید، وہی عابد وہی معبود

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ
خود رند سبو کش خود برسرِ آں کوزہ خریدار بر آمد

رموزِ رقص

جس طرح ظاہر میں مجذوب ایک مخصوص دائرے میں گھوم رہا ہوتا ہے، بالکل اسی طرح روحانی اعتبار سے بھی انسان ایک مخصوص دائرے میں تیر رہا ہے۔کائنات میں تکرار محض تغیر اور تغیر کا نظم دراصل انہدامِ کہن اور نمودِ نو کی بنیاد پر قائم ہے۔گویا اشیاء ٹوٹ تو رہی ہیں لیکن ٹوٹنے کے بعد ایک نئی شکل میں نمودار ہو جاتی ہیں اور یہ سارا عمل ایک مخصوص دائرے میں وقوع پذیر ہو رہا ہے۔دائرے سے باہر کا امکان محالِ مطلق ہے، پس یہی رقصِ رومی کا مغز ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان جذباتی طور پر ایک مخصوص دائرے میں گھوم رہا ہے اور عام تصور یہ ہے کہ گھومنے والی چیز ہمیشہ مکرر ہوتی رہتی ہے جبکہ یہاں پہ معاملہ اسکے برعکس ہے۔مطلب اشیاء گھوم تو رہی ہیں لیکن تکرار کی بجائے تغیر کی نمو ہو رہی ہے۔اسی اہم نکتہ کو حضرت علامہ اقبال ضربِ کلیم میں کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا

حضرت سیدی کا مخصوص رقص بھی دراصل روحانی حادثات کا مقابلہ کرنے کیلئے اکسیر کا کام

کرتا ہے۔ گویا رقصِ سیدی انسانی روح کو ایک عجیب تمازت وحلاوت سے روشناس کراتا ہے۔

سالکین کے لطف کیلئے ذیل میں ہم سیدی کے چند نادر رباعیات پیش کرتے ہیں:

منقبت حضرت مولاعلی کرم اللہ وجہہ

ای شاہ شاہان جہان اللہ مولانا علی
ای نور چشم عاشقان اللہ مولانا علی

تا صورت پیوند جہاں بود علی بود
تا نقش زمیں بود زماں بودعلی بود

شاہے کہ ولی بود وصی بود علی بود
سلطان و سخا و کرم وجود علی بود

وجہے کہ بیاں کرد خدا وند در احمد
آن وجہہ بیاں کرد و بہ فرمودہ علی بود

چنداں کہ نظر کردم و دیدم بہ حقیقت
ازروئے یقیں برہمہ موجود علی بود

آں شاہ کہ بادانش دیں بود علی بود
مسجود ملک ساجد و معبود علی بود

آں نکتہ تحقیق حقائق بہ حقیقت
کز روئے یقیں مظہرِ حق بود علی بود

رنگِ کلاچوی

آج رنگ ہے ری ماں رنگ ہے
میرے خواجہ کے گھر رنگ ہے

گلہائے شمائل

☆ عشق محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چراغ کو ہمیشہ اپنی روح کے طاق میں جلائے رکھیں اور کسی بھی طور اس چراغ کی لو بجھنے نہ پائے۔

☆ اپنے اپنے مسلک کی جانب سے بیان کردہ تمام شرعی اعمال کی مکمل پاسداری کریں کہ ایسا کرنے سے انسان نظم وضبط میں رہتا ہے۔

☆ بغیر ضرورت کے کسی بھی طرف دھیان نہ دیں اگر کسی طرف دھیان دینا ضروری ہو تو ایک وقت میں صرف ایک طرف دھیان دیں۔

☆ بغیر ضروت کے اِدھر اُدھر دیکھنے سے پرہیز کریں، عین ممکن ہے نظر کسی مہلک منظر کا تعاقب کرنے نکل جائے اور پھر واپسی ناممکن ہو۔

☆ بولنے سے پہلے صرف ایک بار یہ ضرور سوچ لیں کہ میرے منہ سے نکلنے والے الفاظ کہیں مخاطب کی روح کو تو مجروح نہیں کردیں گے کیونکہ روح کا زخم جسم کے زخم سے زیادہ مہلک اور اذیت ناک ہوتا ہے اگر ایسا ہو تو خاموشی بہتر ہے۔

☆ اولاد یا مشققین کی تادیب ضروری ہو تو محبت بھرا لہجہ اور نرم الفاظ استعمال کریں۔

☆ آپ کے جسم کا انگ انگ دوسرے انسان کی روح وجسم کا محافظ ہو کسی بھی صورت میں اپنے وجود کو کسی کی روحانی یا جسمانی اذیت کا باعث نہ بننے دیں۔

☆ نیکی کو کبھی معمولی تصور مت کریں، چاہے وہ کسی کو اچھا یاد کر کے کیوں نہ حاصل کی جائے گویا کسی کو خوبصورت الفاظ سے یاد کرنا بھی نیکی ہے۔

☆ کسی کو اُس کے پیٹھ پیچھے بُرا کہنے سے یکسر گریز کریں کیونکہ اس سے اُسے کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ آپ اپنے رویہ میں بگاڑ پیدا کر لیں گے۔

☆ کسی کی ذمہ داری اُٹھاتے وقت خود کا وزن کر لیں اگر یہ بوجھ آپ اُٹھا سکتے ہیں تو ضرور اُٹھائیں نہیں تو خوبصورت الفاظ سے معذرت کر لیں۔

☆ وعدہ ایمان کے مساوی ہے کسی سے وعدہ کرتے وقت کئی بار سوچ لیں اگر آسانی کے ساتھ پورا کر سکتے ہیں تو ضرور کریں کیونکہ ایفائے عہد تمام بھلائیوں کی جڑ ہے۔

☆ خود بینی اور خود احتسابی کی عادت ڈالیں کہ یہ عادت انسان کو تمام شرور سے محفوظ کر دیتی ہے۔

☆ بغیر ضرورت کے کھانے سے یکسر گریز کریں کہ ایسا کرنا انسان کو کاہل اور غبی بنا دیتا ہے کبھی کبھی بھوکے رہنے کی عادت بھی سیکھ لیں کیونکہ حدیثِ پاک میں ارشاد ہوا کہ "نفس کا بھوک سے مقابلہ کرو"

☆ خوشی اور غم ایک ساتھ ملتے رہتے ہیں مایوس ہو جانا کفر سے بدتر ہے، فلہٰذا مایوسی سے یکسر گریز کریں۔

☆ تعلق رکھیں لیکن توقع نہ رکھیں کہ تعلق کو برباد کرنے والی چیز توقع ہے۔

☆ مخاطب کا نُداروییہ اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کریں کہ ایسا کرنے سے آپ عظمت کی بلندیوں کو چھونے لگتے ہیں۔

☆ کسی انسان کو بھی حقیر نہ جانیں کہ ایسا کرنے سے آپ گر جاتے ہیں۔

☆ حتیٰ الوسع اپنی خواہشات کو لگام دیں کہ خواہشات جتنی کم ہونگی اُتنا زیادہ سکون نصیب ہوگا۔

☆ اپنی ضروریات احسن طریقے سے پوری کریں لیکن اپنی ضروریات کو بڑھانے سے یکسر گریز کریں کہ ایسا کرنے سے آپ اپنے لئے نئی نئی مصیبتیں پیدا کریں گے۔

☆ لذات بخارات کی مانند ہیں جو جلد ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں فلہٰذا حصولِ لذت کیلئے کسی کی روح یا جسم کو گزند نہ پہنچائیں کہ ایسا کرنے سے آپ لذت تو بھول جائیں گے لیکن کسی کی روح یا جسم پر لگائے گئے زخم نہیں بھول پائیں گے۔

☆ شکایت سے خاموشی بہتر ہے کہ ایسا کرنے سے انسان تعلق محفوظ کر لیتا ہے۔

☆ استطاعت ہو تو ہمیشہ اپنا ہاتھ کھلا رکھیں کہ ایسا کرنے سے انسان جلد مسیحا بن جاتا ہے۔

☆ احسان کیا کریں اِسی جذبہ کے ساتھ کہ یہ میرا فرض ہے نہ کہ کسی پر اپنی عظمت ثابت کرنے کیلئے ایسا کریں۔

☆ اپنے لئے بہت کم اور دوسروں کیلئے زیادہ سوچا کریں کہ ایسا کرنا انسان کو کامل بنا دیتا ہے

☆ اگر آپ کا ظاہر اُجلا نظر آ رہا ہے تو دوسروں کو آپ کا باطن اس سے بھی اُجلا نظر آنا چاہئے۔

زندگی

زندگی کیا ہے اس سوال سے قطعِ نظر اگر زندگی کو عقیدت میں پرو لیا جائے تو زندگی کا مقصد اپنی پوری رعنائی کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے کیونکہ علم کس نے پایا اور پایا بھی تو آخر کس نے کتنا پایا۔ اگر ہم پانے سے منزہ ہو کر صرف دینے تک پہنچ آئیں تو سکون کی روشنی ہمارے قلب وجگر کو منور کر سکتی ہے جی ہاں! صرف دینا، نہیں دیں گے تو کھو دیں گے خود کو، اردگرد کو اور ایک انمول زندگی کو، سکون کی دولت تعلیم میں نہیں تسلیم میں ہے کیونکہ تسلیم کا ثمرہ آشتی ہے اور تعلیم کا ثمرہ کرانتی، پھر کرانتی بھی تو آشتی کیلئے، گویا زندگی پھر آشتی ہی ہے پس تسلیم کر لو۔

سچ اور جھوٹ

سچ کی ہم اس لئے قدر کرتے ہیں کہ یہ ہماری دسترس میں نہیں، انسانی فطرت کا یہ خاصا ہے کہ جو چیز اس کی دسترس میں نہ ہو ہمیشہ اسکی قدر کرتا ہے اور جھوٹ سے ہم اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ جھوٹ اپنی اصل حالت میں ہمارے سامنے ہے۔ گویا ہمیں سچ کے وجود سے کوئی دلچسپی نہیں ،دلچسپی کا باعث دراصل سچ کی عدم دستیابی ہے۔ اسی طرح جھوٹ سے ہم نفرت نہیں کرتے جھوٹ سے نفرت کا سبب دراصل جھوٹ کی بروقت دستیابی ہے۔

صوفی

صوفی وہ ہوتا ہے جس کا دل و دماغ ہر قسم کی آلائش سے پاک ہو۔ آلائش سے مراد منفی انسانی جذبات ہیں جس میں غصہ، عناد، نفرت، حسد، کینہ اور بغض شامل ہیں۔ جب تک ایک صوفی اپنے نفس کو ان تمام تر آلائشوں سے پاک صاف نہیں کر لیتا اس وقت تک تصوف کے قریب بھی نہیں جا سکتا۔ اسی سارے مرحلے کو تصوف کی اصطلاح میں تزکیہ نفس کہا جاتا ہے۔ جب ایک انسان اس سٹیج پر پہنچ جاتا ہے تو پھر صرف ایک چیز اسکے دل و دماغ میں رچ بس جاتی ہے اور وہ ہے محبت، گویا صوفی کا کل سرمایہ صرف محبت ہی ہوتی ہے اور اگر ادراک ہو تو یہی وہ چیز ہے جس کے سہارے انسان زندگی کے دن کاٹتا ہے۔ ایک گوشت پوست کے انسان سے اگر محبت چھین لی جائے تو پھر اسکے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ آپ کیوں زندہ رہنا چاہتے ہیں، اس لئے کہ آپ کو اپنے وجود سے محبت ہے۔ آپ کو اپنے احساسات عزیز ہیں جس طرح آپ کو زندہ رہنے کیلئے اپنے وجود سے محبت کرنا پڑ رہی ہے بالکل اسی طرح دوسرے بھی اپنے وجود سے محبت کرتے ہیں۔ پس آپ کوئی بھی ایسی حرکت نہ کریں جس کی وجہ سے دوسروں کی محبت میں خلل پیدا ہو کیونکہ آپ نہیں چاہتے کہ آپکی محبت میں کوئی خلل ڈالے۔ پس دوسرے کو بھی اپنے وجود سے محبت کرنے کا حق دیں جو شخص بھی اس نہج پر پہنچ جاتا ہے وہ صوفی کہلاتا ہے۔

وبالِ علم

علم کے معنی ہیں آگاہ ہونا یا جاننا، اور کائنات میں انسان کیلئے اس سے بڑی تباہی اور نہیں

ہوسکتی کہ وہ جان لے، جبکہ انسان آج تک کچھ جان ہی نہیں پایا لیکن جو کچھ موجود ہے اس کا تجزیہ کرلے تو تباہی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ ہر جاننے والے نے یا تو جاننے سے یکسر انکار کردیا یا پھر جان کر اتنا پچھتایا کہ پوری زندگی جاننے کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کے کھڑا رہا۔ دنیائے علم و آگہی کے مستند عالم سقراط حکیم نے کہا تھا کہ "میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔" مولائے روم حضرت سیدی و مرشدی رومی فرماتے ہیں کہ "عقل آئی تو انسان کے ہاتھ سے دین و دنیا دونوں نکل گئے۔" جبکہ آگاہی کے متعلق ماہرِ ہفت زبان حضرت سائیں بابا فرید چاچڑاں والے فرماتے ہیں کہ "مجھے تو جان پہچان نے برباد کیا۔" دین یا مذہب دراصل علم سے ماوراء ایک دائرہ ہے جہاں پر صرف عقیدت کے پھول اُگتے ہیں کیونکہ علم کانٹا اور عقیدت پھول ہیں، جب مطلق سچ کوئی نہیں تو پھر حصولِ علم کی افادیت بھی کوئی نہیں، گویا جہاں سر جھکا وہی علم ہے، وہی سچ ہے۔

کوئی فلسفہ نہیں عشق کا جہاں دل جھکے وہاں سر جھکا
وہیں ہاتھ جوڑ کے بیٹھ جا نہ سوال کر نہ جواب دے

اور سر نہ جھکا تو ندامت کھری، کیا خوب فرماتے ہیں سیدی۔۔۔

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

حکیمی

حکیمی دردِ سر است
این درد سربسر است

سراپا من فرہیم
سرابِ خشک و تر است

نمی دانم چہ گویم
کلام بے اثر است

جنوں را دار لازم
خرد آشفتہ سر است

خموش اے دل آزردہ
فغاں ایں بے ثمر است

مورے خواجہ

نہ جانت موہے نرموہ بنت اب کاسے ہووے
دنت کو چین ناہی ڈست کو رین لوٹے
روت ایسے کہ اب تو مورے سوجھے پپوٹے
کرپا کر مورے خواجہ کہ اب ہردے تروٹے

رقص المعانی

سگِ وحشی غزالِ دشت مل کر رقص کرتے تھے
وہ جوگن گیت گاتی تھی تو اژدر رقص کرتے تھے

تمہاری دید سے پہلے اِنہی درویش آنکھوں کی
جہاں تک روشنی جاتی تھی منظر رقص کرتے تھے

جسے اب روزنِ زنداں کو تکنے سے نہیں فرصت
اُسی قاتل کے چھو لینے سے پتھر رقص کرتے تھے

کسی تصویر میں آتے ہی کیسے زرد پڑ گئے ہیں
وہ ساتوں رنگ جو اِس کینوس پر رقص کرتے تھے

کوئی مانے نہیں مانے کوئی سمجھے نہیں سمجھے
قلندر رقص کرتے تھے پیمبر رقص کرتے تھے

اس کتاب میں آخر ہے کیا ......

دینی، علمی اور حکمت سے بھرپور خزانے، قوانین قدرت، عشق کی راہیں، تصوف کے درجات، شریعت وطریقت، مجذوبیت کا کرب، اولیاء اور صوفیاء کے کمالات، معرفتِ ولایت، عشق و جد وسرور اور فنا تک پہنچنے کے مراحل... لیکن یہ سب کچھ پڑھنے سے پہلے کچھ بتانے اور سمجھانے والی ایک عام سی بات.......

کیا ہم سب جانتے ہیں کہ دین تہذیبُ النفس ہے اور تہذیبُ النفس کا محور دراصل تصوف ہے۔ تصوف کی اصل ''محبت'' ہے، نفس کو اگر صرف ایک منفی رویہ (نفرت) سے پاک کرلیا جائے تو انسان دین و دنیا میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ عشق کی سائنس میں اسی دینِ محبت کو جدید صوفیانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک ایسی محبت جس کو عقلی ذرائع سے سمجھایا گیا ہے کیونکہ آجکل لوگ محبت سے کم اور عقل سے زیادہ پیش آتے ہیں۔ انسان نے اپنے اندر وہ کون سی کیمیاء چھپا رکھی ہے جس کے ذریعے عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک پہنچنا نہایت آسان ہوجاتا ہے۔ علمُ و تہذیب سے شروع ہوتا ہوا یہ دلچسپ روحانی سفر عشقِ مجازی کی تمام تر رعنائیوں میں مدغم عشقِ حقیقی کیلئے اپنا آپ ایسے پیش کر دیتا ہے جیسے خوشبو ہوا کے حضور سر بسجود ہو جاتی ہے۔ حقیقی معنوں میں یہ عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کی روحانی کہانی ایک جہاندیدہ مجذوب کی زبانی ہے۔ آیئے! اِس کتاب کے ذریعے اپنی دنیا اور آخرت سنوارنے کیلئے سفرِ عشق کی طرف کوچ کرتے ہیں۔

ISBN 9789686320043

فیکٹ پبلیکیشنز

Website: www.factpublications.com
Email: info@factpublications.com